قرآن کریم اور سنت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۹ شمارہ: ۳

ربیع الاول: ۱۴۳۷ھ - جنوری: ۲۰۱۶ء

قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول

مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر

نائب مدیر

مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات''، جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی نمبر: 5، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر 3465

فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 101900-397-7 برانچ کوڈ: 0816

مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی 74800

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر

بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email:*** bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرست مضامین

بصائر وعبر

نظریۂ پاکستان اور آئین پاکستان سے بغاوت کیوں؟!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ

مقالات ومضامین

انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت کی حفاظت کی ضرورت!	۱۰	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
جاوید احمد غامدی، سیاق وسباق کے آئینہ میں (قسط:۱۴)	۱۴	مولانا فضل محمد یوسف زئی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخِ ولادت..... تحقیق وترجیح	۲۳	مفتی رضاء الحق، ساؤتھ افریقہ
۶۳ رسالہ حیات نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی ایک جھلک	۲۹	مفتی محمد راشد ڈسکوی
قرآنی رسم الخط!	۳۴	قاری ضیاء الحق
دینی واصلاحی جلسے..... چند قابلِ توجہ پہلو	۴۴	مولانا نایاب حسن قاسمی، انڈیا
حلال وحرام سے متعلق ریاست کی ذمہ داری (قسط:۱)	۴۸	مفتی شعیب عالم
نسلِ نو پر مغربی تعلیم کے اثرات کا طائرانہ جائزہ (قسط:۲)	۵۲	جناب سید خالد جامعی

یادِ رفتگان

پیر طریقت جناب حاجی عبدالرشید رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت	۶۱	محمد اعجاز مصطفیٰ

دار الافتاء

اسٹیٹ بینک کی ملازمت!	۶۳	ادارہ

www.banuri.edu.pk

نظریۂ پاکستان اور آئین پاکستان سے بغاوت کیوں؟!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

گزشتہ چند عشروں سے ’’اسلامی جمہوریہ پاکستان‘‘ کے اربابِ اقتدار اور عدل وانصاف کی کرسی پر فائز بعض جج صاحبان کے بیانات اور ریمارکس اس طرح کے رپورٹ کیے گئے جن سے یوں معلوم محسوس ہوتا ہے کہ شاید یہ حضرات ملک پاکستان کے باشندے اور نمائندے نہیں، بلکہ کسی سیکولر ملک کے ترجمان وراہنما ہیں، جو اہالیانِ پاکستان سے مخاطب ہیں، قارئین بینات بھی ان بیانات سے مستفید ہوں:

۱:.....سپریم کورٹ کے جسٹس جناب سرمد جلال عثمانی صاحب نے سود کے خاتمہ کے متعلق دائر کی گئی درخواست کی سماعت کے وقت ریمارکس دیتے ہوئے فرمایا کہ:

’’جس نے سود نہیں لینا، وہ نہ لے اور جو سود لیتا ہے، اس سے اللہ تبارک وتعالیٰ ہی آخرت میں پوچھے گا، سپریم کورٹ سے باہر مدرسہ کھول کر لوگوں کو سود کی حرمت کا درس نہیں دیا جاسکتا۔‘‘

۲:.....اسلامی جمہوریہ پاکستان کے صدر عزت مآب جناب صدر ممنون حسین صاحب نے ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

’’ہاؤس بلڈنگ فنانس سے جو لوگ قرضہ لیتے اور اس پر سود دیتے ہیں، میں علماء سے گزارش کرتا ہوں کہ اس پر غور کریں، چونکہ مجبوری ہے اور کوئی اور راستہ نہیں ہے ان کے لیے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے لیے سود کی ادائیگی کو جائز قرار دیا جائے، اس پر بحث کریں۔‘‘

۳:.....اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیر اعظم جناب میاں محمد نواز شریف صاحب امریکی دورے سے واپسی پر ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

www.banuri.edu.pk

''عوام کا مستقبل جمہوری اور لبرل پاکستان ہے۔''

۴:.....اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیراعظم صاحب نے مسلم لیگ (ن) منارٹی ونگ کے تحت ہندوؤں کے مذہبی تہوار دیوالی میں شریک ہوکر حاضرین سے خطاب کرتے ہوئے جہاں یہ فرمایا کہ: ''میں سب کا وزیراعظم ہوں، ظالم مسلمان ہے تو مظلوم ہندو کا ساتھ دوں گا۔''

وہاں یہ بھی فرمایا کہ: ''میں اپنے ہندو دوستوں سے گلہ کرتا تھا کہ مجھے بھی اپنی خوشیوں میں شریک کریں، میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ہولی میں بھی بلائیں اور مجھ پر رنگ پھینکیں۔''

قطع نظر اس کے کہ قرآن کریم اور سنت رسول اللہ (ﷺ) کی اس بارہ میں کیا ہدایات، تعلیمات اور تصریحات ہیں، جس آئین کا حلف اٹھاتے ہوئے یہ حضرات ان عہدوں پر متمکن ہوئے، یہاں صرف اس آئین کے چند حوالہ جات نقل کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

آرٹیکل: ا کی دفعہ نمبر: ا میں لکھا ہے کہ: ''مملکت پاکستان ایک وفاقی جمہوریہ ہوگی، جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا، جسے بعد ازیں پاکستان کہا جائے گا۔''

اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ: ''آئین میں پاکستان کو جمہوری ریاست قرار دیا گیا ہے۔ جمہوری ریاست میں کسی مخصوص جماعت، فرقے یا فرد کی بجائے اقتدار بحیثیت مجموعی عوام کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ جمہوریت میں خواہ وہ معاشرتی ہو یا اقتصادی انسانی اداروں کا انتظام عوام خود اپنی بہتری کے لیے چلاتے ہیں۔ پاکستان کو نہ صرف آئین میں جمہوری ریاست قرار دیا گیا ہے، بلکہ اسے اسلامی جمہوریہ کا نام بھی دیا گیا ہے، اس اعتبار سے ریاست کا کوئی قانون قرآن وسنت کے منافی نہیں بنایا جاسکتا۔ پاکستان چونکہ اسلامی جمہوری مملکت ہے، اس لیے اقتدار اعلیٰ خدائے بزرگ و برتر کو حاصل ہے، اس اقتدار اعلیٰ کے تحت پاکستان کے عوام کو حکمرانی کا اختیار ایک مقدس امانت کے طور پر عطا کیا گیا ہے۔ سورۃ النساء آیت: ۵۸ میں اللہ تعالیٰ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا ۔'' ترجمہ: ''بے شک تم کو اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو پہنچا دیا کرو۔'' آئین کے دیباچے میں بھی واضح الفاظ میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ حکمرانی کے اختیار کی یہ مقدس امانت عوام اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے بروئے کار لائیں گے۔ اس اعتبار سے یہ ذمہ داری عوام کو سونپ دی گئی ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کا انتخاب کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ کہیں وہ ایسے نمائندوں کا انتخاب تو نہیں کر رہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے عطا کی گئی اقتدار کی امانت میں خیانت ہو۔ دوسرا فرض ان نمائندوں پر بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے فرائض کی بجا آوری میں اس امانت کی حفاظت کریں جو ان کے سپرد کی گئی ہے۔ اس کا مطمح نظر بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح

کے اس اعلان کے مطابق ہے کہ پاکستان سماجی انصاف کے اسلامی اصولوں پر مبنی ایک جمہوری مملکت ہوگی۔'' (آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان، ۱۹۷۳ء، ص:۲۲، ط:منصور بک ہاؤس لاہور)

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے آئین کے آرٹیکل:۲ میں لکھا ہے: ''اسلام پاکستان کا مملکتی مذہب ہوگا۔''

اور اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ: ''اس سے مراد یہ ہے کہ اسلام کو مملکت کے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل ہوگی اور اس کے لیے کوئی بھی قانون قرآن وسنت کے خلاف نہیں بنایا جائے گا اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ تمام قوانین اسلام کے سانچے میں ڈھالے جائیں گے جو اسلامی قوانین سے متصادم ہوں گے، تاکہ صحیح معنوں میں اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیا جاسکے۔ شریعت کورٹ' اسلامی نظریاتی کونسل کو خصوصی طور پر یہ کام سونپا گیا ہے کہ وہ تمام قوانین کا جائزہ لے اور اگر کوئی قانون ان کی نظر میں اسلام کی تعلیمات سے مطابقت نہ رکھتا ہو تو اس کی تنسیخ کے لیے سفارش کی جائے، تاکہ پارلیمنٹ اس کی تنسیخ کے لیے قانون وضع کرے۔''

(آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان، ۱۹۷۳ء، ص:۲۲-۲۳، ط:منصور بک ہاؤس لاہور)

آرٹیکل:۳۱، دفعہ نمبر:۱ ہے کہ: ''پاکستان کے مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق مرتب کرنے کے قابل بنانے کے لیے اور انہیں ایسی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے، جن کی مدد سے وہ قرآن پاک اور سنت کے مطابق زندگی کا مفہوم سمجھ سکیں۔'' (آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان، ۱۹۷۳ء، ص:۶۱، ط:منصور بک ہاؤس لاہور)

اور اس کی تشریح میں لکھا ہے کہ: ''اس تحتی دفعہ میں حکومت پر یہ ذمہ داری عائد کی گئی ہے کہ وہ مسلمانوں کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی اسلام کے بنیادی اصولوں اور اساسی تصورات کے مطابق بسر کرنے کے قابل بنائے اور انہیں ایسی سہولتیں میسر کرے، جن کی مدد سے وہ قرآن وسنت کے مطابق اپنی زندگیاں ڈھال سکیں اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہوسکتا ہے کہ وہ تمام نافذ العمل قوانین جو قرآن وسنت کے مطابق نہیں ہیں، انہیں قرآن وسنت کے مطابق بنا کر ان پر عمل درآمد بھی کرایا جائے، یہ عوام کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ خود بھی اپنی زندگیوں کو اسلام کے مطابق بسر کرنے کی ہر ممکنہ سعی کریں، تاکہ ایک مثالی معاشرہ وجود میں آسکے۔'' (آئین اسلامی جمہوریہ پاکستان، ۱۹۷۳ء، ص:۶۱، ط:منصور بک ہاؤس لاہور)

آرٹیکل:۳۸ کی دفعہ ''و'' ہے کہ: ''ربا کو جتنا جلد ممکن ہو (حکومت) ختم کرے گی۔'' (ایضاً، ص:۷۲)

آئین پاکستان کے ان آرٹیکل اور دفعات کو بھی دیکھتے جایئے اور ان بیانات کو بھی پڑھتے جایئے تو ہر باشعور شخص یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہوگا کہ لگتا ہے کہ شاید نظریۂ پاکستان سے جان چھڑانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ نظریۂ پاکستان اور آئین پاکستان کو طاقِ نسیاں کی زینت بنایا جارہا ہے۔

کچھ عرصہ قبل یہ باتیں صرف ان خواتین وحضرات کی زبان پر ہوتی تھیں جن کو ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے نام سے چڑ تھی، جو مغربی تہذیب کے دل دادہ تھے یا وہ نام نہاد اسکالر تھے جو مغربی تعلیم گاہوں کے تعلیم یافتہ اور مستشرقین اساتذہ کے تربیت یافتہ تھے اور آج حال یہ ہے کہ یہ بیانات ان معزز اور مقتدر شخصیات کی زبانوں سے ادا ہورہے ہیں جن کے ہاتھوں میں ملک پاکستان کی زمام اقتدار ہے، کیا کہا جائے کہ دین اسلام کی تعلیمات کی کمی کی بنا پر یہ باتیں کہی جارہی ہیں یا کوئی خفیہ ایجنڈا ہے جس کی تکمیل کے لیے دھیرے دھیرے اس جانب سفر کیا جارہا ہے۔

جنرل ایوب خان کے زمانہ میں بھی ایسے نام نہاد اسکالروں کی وجہ سے اسلامی تعلیمات واحکام کا حلیہ بگاڑا گیا اور عائلی قوانین کے نام سے خلافِ اسلام باتیں مسلمانوں پر مسلط کی گئیں، جن کا خمیازہ آج تک پاکستانی مسلمان بھگت رہے ہیں۔

یہ بات واضح ہے کہ سود کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں صریح طور پر نہ صرف یہ کہ حرام قرار دیا ہے، بلکہ سودی معاملہ برقرار رکھنے کو اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ سے جنگ کے مترادف بھی قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوْا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَابَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ، فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَأْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ۔'' (البقرۃ:۲۷۸-۲۷۹)

''اے ایمان والو! ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو جو کچھ باقی رہ گیا ہے سود اگر تم کو یقین ہے اللہ کے فرمانے کا، پھر اگر نہیں چھوڑتے تو تیار ہو جاؤ لڑنے کو اللہ سے اور اس کے رسول سے۔''

حضور اکرم ﷺ نے سود کی حرمت کے متعلق فرمایا:

۱:...''عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللّٰه ﷺ آكل الربا وموكله وكاتبه وشاهديه وقال: ''هم سواء۔'' رواه مسلم۔'' (مشکوٰۃ،ص:۲۴۴،ط:قدیمی)

ترجمہ:''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے ربا کھانے والے، کھلانے والے، (اس کا حساب کتاب) لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت کی ہے، اور فرمایا کہ: یہ سب (سود کے گناہ میں) برابر ہیں۔''

۲:.....''وعن عبد اللّٰه بن حنظلة غسيل الملائكة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: درهم ربا يأكله الرجل وهو يعلم أشد من ستة وثلاثين زنية۔''رواه أحمد والدراقطني، وروى البيهقي في شعب الإيمان عن ابن عباس رضی اللہ عنہ وزاد: وقال: من نبت لحمه من السحت فالنار أولى به۔'' (مشکوٰۃ،ص:۲۴۵،ط:قدیمی)

ترجمہ:''حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ -جو غسیل الملائکہ ہیں- سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سود کا ایک درہم جسے آدمی جانتے بوجھتے کھاتا ہے چھتیس (۳۶)

مرتبہ زنا کرنے کے برابر ہے.....اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، انہوں نے یہ جملہ زائد کیا ہے کہ: ''جس کا گوشت حرام سے پیدا ہوا ہو تو وہ آگ کے زیادہ لائق ہے۔''

۳:.....''وعن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: الربا سبعون جزءً أيسرها أن الرجل أمه۔'' (مشکوٰۃ، ص: ۲۴۶، ط: قدیمی)

ترجمہ: ''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: سود کے ستر حصے ہیں، ان میں سب سے کم یہ ہے کہ جیسے آدمی اپنی ماں سے زنا کرے۔''

۴:.....''وعن ابن مسعود رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: إن الربا وإن كثر فإن عاقبتهٗ تصير إلٰى قل، رواهما ابن ماجة والبيهقی فی شعب الإيمان. وروى أحمد الأخير۔'' (مشکوٰۃ، ص: ۲۴۶، ط: قدیمی)

ترجمہ: ''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ربا اگرچہ کتنا ہی زیادہ کیوں نہ ہو جائے، اس کا انجام کمی (کی صورت میں ہی نکلتا) ہے۔''

۵:.....''وعن أبی هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللّٰه ﷺ: أتيت ليلة أسری بی علی قوم بطونهم كالبيوت فيها الحيات ترى من خارج بطونهم فقلت: من هؤلاء يا جبريل؟ قال: هؤلاء أكلة الربا. رواه أحمد وابن ماجة۔'' (مشکوٰۃ، ص: ۲۴۶، ط: قدیمی)

ترجمہ: '' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: معراج کی رات میرا گزر ایسی قوم پر ہوا جن کے پیٹ گھروں کی مانند تھے جن میں سانپ تھے، جو پیٹ کے باہر سے ہی نظر آرہے تھے، میں نے کہا: اے جبریل! یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ: یہ سود کھانے والے ہیں۔''

۶:.....''وعن علی رضی اللہ عنہ أنه سمع رسول اللّٰه ﷺ لعن آكل الربا وموكله وكاتبه ومانع الصدقة وكان ينهى عن النوح. رواه النسائی۔'' (مشکوٰۃ، ص: ۲۴۶، ط: قدیمی)

ترجمہ: '' حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپ ﷺ سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کے لکھنے والے اور صدقہ روکنے والے پر لعنت فرما رہے تھے اور نوحہ سے منع فرما رہے تھے۔''

یہ دو آیات اور چند احادیث مبارکہ وہ ہیں جو نوکِ قلم پر آگئیں ہیں جن میں سود کھانے کی اتنا سخت وعیدات ہیں کہ ان کو دیکھتے ہوئے کون مسلمان ایسا ہوگا جو پھر بھی سودی معاملہ کرے گا یا سود کی حلت کے متعلق لب کشائی کی جسارت کرے گا۔

جناب صدر! اجتہاد اور بحث کی گنجائش اور ضرورت تو ان معاملات میں ہوتی ہے جہاں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کوئی نص یا ہدایت موجود نہ ہو، جہاں اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے

واضح ارشادات اور احکام موجود ہوں، وہاں کسی بحث وتمحیص اور غور وخوض کی چنداں ضرورت نہیں۔

....

جناب وزیراعظم صاحب! یہ خطۂ ارضی اس لیے حاصل کیا گیا تھا اور مسلم قوم سے وعدہ یہ کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی نظام نافذ کیا جائے گا اور اسلامی نظام کو اپنایا جائے گا اور یہ کہا گیا تھا کہ ان شاء اللہ! پاکستان میں اسلامی نظام کی برکات اور انوارات دیکھ کر نہ صرف یہ کہ عالم اسلام کا ہر ملک اس سے مستفیض ہوگا، بلکہ غیرمسلم ممالک کو اسلام کے قریب لانے اور ان کو مسلمان بنانے کے لیے یہ معاشرہ محرک ثابت ہوگا، اس لیے بجا طور پر کہا جاتا تھا کہ پاکستان کی بنیاد اسلام پر ہے، پاکستان محض اسلام کی خاطر وجود میں آیا اور عوام کو یہ نعرہ دیا گیا: ''پاکستان کا مطلب کیا: لاإلٰہ إلا اللّٰہ۔''

وزیراعظم صاحب! جب پاکستان کی اساس اور بنیاد ہی اسلام پر ہے تو اسلام میں کسی ازم کی گنجائش نہیں، آج ہمارے ملک میں جو مشکلات در آئی ہیں، وہ ہرگز ہرگز اسلام کی پیدا کردہ نہیں، بلکہ حکمرانوں نے اسلامی نظام -جس کے نام پر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا- کو پس پشت ڈال کر اور مغربی سرمایہ دارانہ نظام کو اپنانے کی بنا پر یہ مشکلات پیدا کی ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ دور بدل گیا ہے اور جدید دور کے جدید تقاضے ہیں، اس لیے ہمیں نئے نظام اور نئے ازم کی ضرورت ہے تو ایسا آدمی بہت بڑی غلطی میں مبتلا ہے، اس لیے کہ جدیدیت مادی چیزوں میں ہوتی ہے، معنوی چیزوں میں جدیدیت نہیں ہوتی، دنیوی ضروریات مثلاً: سواری، مکان، جنگی آلات وغیرہ ان میں تو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق جدت لائی جائے گی، لیکن اسلام، مذہب، اسلامی فکر، اسلامی احکام، اسلامی اقدار، حیا کرنا، سچ بولنا، وعدہ خلافی نہ کرنا اس طرح کے تمام اسلامی احکام ان میں کسی دور میں کوئی تبدیلی نہیں ہوگی، جو حکم اسلام کا چودہ سو سال پہلے تھا آج بھی وہی ہوگا، جو اخلاقیات صدیوں سے چلی آرہی تھیں آج بھی انہیں اخلاقیات میں ترقی اور کامیابی ہوگی، اس لیے کہ یہ نظام اللہ تبارک وتعالیٰ - جو علیم وخبیر ہے- کا بنایا ہوا ہے، جو قیامت تک آنے والی نسلوں، ان کے امراض وعوارض، ان کی حاجات وضروریات کو جانتا ہے، اس کا علم گزشتہ اور آئندہ سب پر محیط ہے، اس کی قدرت کامل ومکمل ہے۔

ہمارے وزیراعظم صاحب نے یہ کہہ کر کہ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ہولی میں بھی بلائیں اور مجھ پر رنگ پھینکیں'' نہ اسلام کی پرواہ کی ہے، نہ ملک اور ملت کے نظریہ کی۔ ہوسکتا ہے کہ وزیراعظم صاحب نے رواداری کی بنا پر یہ باتیں ارشاد فرمائی ہوں، لیکن رواداری کی بھی کچھ حدود اور قیود ہوتی ہیں۔ حضور ﷺ نے ہمیشہ غیرقوموں کے افعال واعمال کو اپنانے کی ممانعت فرمائی ہے، چاہے ان کا تعلق عام عادات سے کیوں نہ ہو، چہ جائیکہ غیرمسلم اقوام کی مذہبی رسومات میں شمولیت اختیار کی جائے اور ان کو اپنانے کی تمنائیں کی جائیں۔

جناب وزیراعظم صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ ہندوؤں میں جاکر اسلامی اقدار اور اخلاقیات

کو اجاگر کرتے ، ان کو اسلامی تعلیمات سے روشناس کراتے ، جس سے ان کو اسلام کے بارہ میں اچھا تأثر ملتا اور ہوسکتا ہے کہ بعض شرکاء کو اسلام کو اپنانے اور مسلمان ہونے کی توفیق ہو جاتی ۔

بہرحال اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری دین اور کامل ومکمل دین ہے جو انسانیت کی فلاح و بہبود، کامیابی وکامرانی کے لیے نازل کیا گیا، اسلام ہی مرد وعورت ، بوڑھے وجوان ، امیر وغریب ، حاکم ومحکوم ، مسلم وکافر ہر ایک کے حقوق وآداب کا محافظ ونگران ہے، اور دین اسلام میں ہر ایک کی مصلحت ورعایت کو مدنظر رکھا گیا ہے ۔ اب دین بحیثیت دین صرف دین اسلام ہی ہے، اس کے علاوہ تمام ادیان ومذاہب منسوخ ومتروک قرار دیئے گئے ، اب کوئی دانشور یا منصب دار دین اسلام کے علاوہ کسی اور دین کو اختیار کرے گا یا اسے اپنائے گا تو بارگاہِ رب العزت میں وہ ہرگز ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا ، بلکہ یہ ’’عقل مند‘‘ اور ’’صاحب ارجمند‘‘ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خسارے اور نقصان کا سزاوار ہوگا ۔

نیز جن قوموں نے اسلام سے بے اعتنائی اور روگردانی برت کر ارتقاء کی منزلیں طے کیں وہ آج تک راحت وآرام کے تمام اسباب جمع کر لینے کے باوجود حقیقی آرام وسکون سے کوسوں دور اور بےسکونی وبےآرامی کے سبب ’’عذاب الیم‘‘ میں گرفتار نظر آتی ہیں ۔

اہل اسلام کو تو اس بات پر خوش ہونا چاہیے تھا اور اس نظام کو اپنانا چاہیے تھا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اسلام کی دولت سے نوازا اور انہیں صاف ستھرا اور اعلیٰ اخلاق وکردار سے مرصع دین ومذہب عطا کیا ، لیکن طویل غلامی نے مسلمانوں کو اس نعمت عظمیٰ کی قدر دانی سے محروم کر دیا ، جس کی بنا پر وہ قرآن وسنت کے احکام کی بجا آوری کے بجائے غیر مسلم اقوام کے اوضاع واطوار اور طرزِ زندگی کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں ، یاحسرتاہ ۔

وصلی اللّٰہ تعالٰی علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد وعلٰی آلہٖ وصحبہٖ أجمعین

خاص نمبرات ماہنامہ ’’بینات‘‘

①	حضرت مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ	350/= روپے
②	حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید رحمۃ اللہ علیہ	300/= روپے
③	حضرت مفتی محمد جمیل خان شہید رحمۃ اللہ علیہ	350/= روپے
④	حضرت مولانا سعید احمد جلال پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	300/= روپے
⑤	حضرت مولانا عطاء الرحمٰن شہید رحمۃ اللہ علیہ	100/= روپے
⑥	حضرت مفتی عبدالمجید دین پوری شہید رحمۃ اللہ علیہ	100/= روپے

انبیاء کرام علیہم السلام کی وراثت کی حفاظت کی ضرورت!

محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

’’نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ ونؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور أنفسنا ومن سیّأٰت أعمالنا ، من یھدہ اللّٰہ فلامضل لہٗ ومن یضللہ فلاھادی لہ ، وأشھد أن لاإلٰہ إلا اللّٰہ وحدہٗ لاشریک لہ ، وأشھد أن سیدنا ومولانا محمدا عبدہٗ ورسولہ ، أرسلہ بالحق بین یدی الساعۃ بشیرا ونذیرا، صلی اللّٰہ علیہ وعلٰی آلہٖ وأصحابہٖ وأتباعہٖ وعلماء أمتہٖ وصالح عبادہٖ وبارک وسلم تسلیما کثیرا، أما بعد: فأعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم ’’وَمَاأُمِرُوْا إِلَّا لِیَعْبُدُوْا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَاءَ وَیُقِیْمُوْا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوْا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ۔‘‘

تمام اعمال کی بنیاد اخلاص ہے

محترم بھائیو اور معزز سامعین! میں پشتو بھول گیا ہوں، پشتو نہیں آتی، اگرچہ اپنی زبان ہے، مگر تھوڑی استعمال ہوتی ہے، ویسے بھی مقرر اور خطیب نہیں ہوں، لیکن جو کچھ آتی تھی وہ بھی بھول گیا ہوں، بہرحال تقریر کرنے کے لیے نہیں بیٹھا، میں اس پر مامور ہوگیا ہوں، اس لیے ایک نکتہ بیان کرتا ہوں، جتنے بھی دین کے کام ہیں یا دین کے نام پر ہورہے ہیں، اگر ان میں اخلاص اور خدا تعالیٰ کی رضاء نہ ہو تو وہ خدا تعالیٰ قبول نہیں کرتا، تم جتنی بھی ترقی کرلو، جتنے بھی بڑے عالم بن جاؤ، جتنے بھی بڑے فاضل بن جاؤ، علامۂ زمان اور علامۂ دہر بن جاؤ، نہایت فصیح و بلیغ خطیب بن جاؤ، اعلیٰ مقرر بن جاؤ، مصنف بن جاؤ، مفتی بن جاؤ، اگر اس میں اخلاص اور خدا تعالیٰ کی رضاء نہ ہو اور مقصود اس میں خدا تعالیٰ کی رضاء نہ ہو تو یہ سب کچھ بیکار ہے، حق تعالیٰ کے نزدیک وہ چیز کھوٹی ہے جس میں اخلاص نہ ہو۔

مسند احمد، ابن ماجہ، ابوداؤد کی حدیث ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: ’’وہ علم جس سے حق تعالیٰ کی رضاء حاصل ہوسکتی ہے، اگر انسان اس سے دنیا کی کوئی متاع حاصل کرے

www.banuri.edu.pk

تو جنت کی ہوا اس پر نہ لگے گی۔'' اتنی سخت وعید آئی ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی وراثت

یہ انبیاء علیہم السلام کے علوم ہیں، یہ مدارس جن میں آپ اور ہم بیٹھے ہیں ان کا دعویٰ ہے اور یہ ارادہ ہے کہ ہم نبوت کے علوم جاری کرتے ہیں، ان کی وراثت کی حفاظت کرتے ہیں اور ان کے وارث ہم بنتے ہیں اور ہم طلبہ اس ارادہ سے آتے ہیں۔ یاد رکھو! علومِ نبوت کا پہلا قدم، بسم اللہ یہ ہے کہ صرف اللہ کی رضاء ہو، اگر آپ کا ارادہ یہ ہے کہ میں اچھا عالم بن جاؤ، اچھا مصنف، شیخ الحدیث ہوجاؤں، مفتی اور استاد بن جاؤں، اونچی تنخواہ مل جائے تو یہ تمام چیزیں آپ کو پیچھے ڈالنے والی ہیں اور اس میں برکت پیدا نہ ہوگی، پھر تو یہ وراثت انبیاءؑ نہ ہوئی، بلکہ وراثت دنیا ہوئی۔ آپ سے اور ہم سے تو پھر وہ لوگ مبارک ہیں، جو مزدوری کرتے ہیں، تجارت کرتے ہیں، دکانداری کرتے ہیں، زراعت کرتے ہیں، دنیا کے جو کام ہیں کرتے ہیں اور دنیا کماتے ہیں، خدا کے نزدیک وہ بہت اچھا ہے جو کسب حلال کرتا ہے، نفقہ کے لیے مال کماتا ہے، ان طریقوں سے جو اللہ نے کسب مال کے لیے پیدا کیے ہیں، جائز قرار دیئے ہیں، ان طریقوں کو یہ اختیار کرتا ہے، یہ شخص نہایت سعید مبارک ہے، بہ نسبت اس آدمی کے جو دین کی چیز کو دنیا کا ذریعہ بناتا ہے۔

شقی و بدبخت انسان

ایک بچے کے ہاتھ میں قیمتی یاقوت، جوہر، زمرد ہے اور اسے پتھر سمجھ کر دکاندار سے دو پیسوں کی چیز گُڑ، چنے لے آئے تو آپ کہیں گے کہ اس نے کتنا ظلم کیا ہے! کیا تکلیف دہ واقعہ ہے کہ گویا لاکھوں کی چیز چند پیسوں پر دے دی! قسم ہے اللہ کی ذات کی کہ وہ شخص جو بخاری کی حدیث پڑھاتا ہے اور قرآن پڑھاتا ہے اور دین کا عالم بنتا ہے اور وہ پھر دنیا کا ارادہ کرتا ہے، اس سے نچلے درجہ کا شقی اور بدبخت نہیں، یہ اس بچے سے ہزار درجہ زیادہ احمق ہے۔

تصحیح نیت ضروری ہے

اس وجہ سے آپ اپنی نیت صحیح کردو، مقصد آپ کے علم کا اللہ کی رضاء ہے اور اخلاص ہے ''وَمَاأُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ '' آپ بالکل ایک طرف حنیف بنیں۔

حنیف کا معنی

حنیف کا معنی ہمارے حضرت الاستاذ مولانا انورشاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ شیخ فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ جو مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ سے پہلے بہت بڑا بزرگ ولی اللہ گزرا ہے، مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ

اس کے حق میں کہتا ہے:

ہفت شہر عشق را عطار گشت ۔۔۔ ماہنوز اندر خم یک کوچہ ایم
عطار روح و سرائی دو چشم ۔۔۔ ماپس سرائی و عطار آمدہ ایم

بہرحال شیخ فریدالدین عطار رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کتاب ہے ''منطق الطیر'' عجیب کتاب ہے، اس میں ایک شعر ہے فارسی میں، ہمارے استاد مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حقیقت میں اس شعر میں ترجمہ حنیف کا ادا ہوا ہے، وہ کہتا ہے:

از یکے گو و از دوئی یکسوئے باش ۔۔۔ یک دل و یک قبلہ ویک روئے باش

ظاہر و باطن اللہ کے لیے بنادو، حق تعالیٰ کے تمام انبیاء علیہم السلام، تمام صالحین عباد، تمام مامور ہیں اس پر کہ ''مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ '' اور اگر اخلاص نہ ہوا اور حنیف نہ ہو تو ''خسر الدنیا والآخرۃ۔''

رضاءِ الٰہی

اللہ کی رضاء جنت سے بھی اعلیٰ چیز ہے، تمام نعم جنت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتے، ہم اگر یہ کوشش کریں کہ سند جلدی مل جائے اور ہم مولانا بن جائیں، فاضل اکوڑہ خٹک بن جائیں، فاضل حقانیہ بن جائیں، بڑی جگہ میں لگ جائیں، سکول میں، کالج میں، مدرسہ میں، مدرس مفتی ہوجائیں، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

دین کا دفاع

آپ کا مقصد یہ ہے کہ آپ مجاہد بن جائیں، سپاہی بن جائیں، دین کی خدمت کے لیے اور دین کے مورچہ کا دفاع کریں، وراثت انبیاءؑ کے آپ محافظ ہیں، سپاہی ہیں، آپ کے پاس مال و دولت دین کی جو آئی ہے اس کی پہرہ داری کرو، اگر آپ بھوک سے مر بھی جائیں تب بھی آپ کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کریں۔

نصیحت خاص

اس وجہ سے آپ کو اور ہم کو، تمام اساتذہ کو، بزرگوں بھائیوں کو یہ نصیحت خاص ہے کہ نیت صحیح کردو، مقصد صرف دین بنادو، اللہ کی رضاء بنادو، پھر آپ کہیں گے کہ ''فزت ورب الکعبۃ'' خدا کی قسم! میں کامیاب ہوگیا ہوں، اللہ کی رضامندی کا مقصد حاصل ہوگیا تو آپ کامیاب ہوگئے، اس کے بعد اگر اللہ چاہیں گے تو آپ مدرس، عالم، مولانا، محدث بن جاؤ گے، ورنہ کامیاب تو آپ ہوگئے ہر حال میں، اس لیے چاہیے کہ ہم نیت صحیح کردیں، مقصد مدارس کا یہ تھا کہ ہم وارث انبیاءؑ بن جائیں: ''ان الأنبیاء لم یورثوا دینارا ولا درهما وإنما ورثوا العلم۔'' (سنن ابن ماجہ، حدیث: ۲۲۳)

انبیاء علیہم السلام کی جو وراثت ہے وہ علم ہے، اس کے محافظ بن جائیں، اگر یہ مقام حاصل ہوجائے تو بہت اونچا مقام ہے، فرشتے آپ کے قدموں کے نیچے پر بچھائیں گے، ادب واحترام کی وجہ سے، کتنا اونچا مقام ہے:

www.banuri.edu.pk

نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز　　　　قیمت خود ہر دو عالم گفتہ

دناءت وخساست

کتنی دناءت، خساست، شقاوت اور کتنی محرومی ہے کہ اتنی اونچی جگہ ملنے کے باوجود ہم سودوسو کی نوکری کو ترجیح دیں، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون ۔ اس وجہ سے ''أوصیکم بتقویٰ اللّٰہ '' مقصد یہ ادارہ، مدارس، عمارات، انتظام نہیں ہے، بلکہ مقصد اللہ کی رضاء ہے، ہم ضعفاء ہیں، ہم کمزور ہیں، ہمارے اکابر رحمۃ اللہ علیہم نے جو مشقت اور جو تکالیف اٹھائی ہیں، ان کے برداشت کی ہم میں طاقت نہیں، اس لیے اللہ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمادے، آمین۔

ہم آج عہد کرتے ہیں کہ دین کی خدمت کے لیے تیار رہیں گے، اللہ تعالیٰ دین کی خدمت کرنے والوں کے درجات بلند فرماوے، آمین ۔ أللّٰہم اھدنا وسدّدنا أللّٰہم علمنا ما ینفعنا وزدنا علما وآخر دعوانا أن الحمد للّٰہ رب العالمین وصلی اللّٰہ علٰی خیر خلقہٖ سیدنا محمد و آلہ وأصحابہ أجمعین۔　　　　(بشکریہ: خطباتِ مشاہیر، ج:۳، ص:۳۱۰-۳۱۵)

جاوید احمد غامدی

سیاق وسباق کے آئینہ میں (چودھویں قسط)

مولانا فضل محمد یوسف زئی

جاوید غامدی صاحب نے مرتد کی شرعی سزا کو کالعدم قرار دیا

''حدود اور تعزیرات'' کے بڑے عنوان کے تحت دفعہ: ۴ کے ضمن میں غامدی صاحب منشور کے صفحہ: ۱۸ پر مرتد کی شرعی سزا کو کالعدم قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسی طرح ارتداد کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے کہ اس کی جو سزا بالعموم بیان کی جاتی ہے وہ قرآن مجید کی رو سے نبی ﷺ کی قوم (بنی اسماعیل) ہی کے ساتھ خاص تھی۔ ان کے بعد یہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوئی، چنانچہ اب اگر کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر کفر اختیار کرے اور اس کے ساتھ کسی فساد کا مرتکب نہ ہو تو محض اس بنا پر اُسے کوئی سزا نہیں دی جا سکتی ہے۔'' (منشور: ۱۸)

تبصرہ:..... سب سے پہلے تو یہ پوچھنا ہے کہ جاوید غامدی صاحب کی پوزیشن اور اتھارٹی کیا ہے جو یہ حکم صادر فرمارہے ہیں کہ ''ارتداد کے بارے میں یہ حقیقت تسلیم کی جائے'' وہ کس کو مخاطب بنا رہا ہے اور مخاطب کو کونسی حقیقت تسلیم کروا رہا ہے یا خود جج بنا ہوا ہے اور خود فیصلہ سنا رہا ہے۔ دوسری بات غامدی صاحب نے یہ کہی ہے کہ ''ارتداد کی سزا قرآن کی رو سے نبی علیہ السلام کی قوم بنی اسماعیل کے ساتھ خاص ہے۔'' قرآن مجید کے بارے میں غامدی صاحب نے غلط بیانی سے کام لیا ہے، قرآن عظیم میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس نے ارتداد کی سزا کو عرب یا بنی اسماعیل کے ساتھ خاص کیا ہو، البتہ ارتداد پر وعید شدید اور عذاب جحیم کی سزا قرآن مجید میں اس طرح بیان کی گئی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْأٰخِرَةِ وَأُولٰٓئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خَالِدُوْنَ۔'' (البقرۃ: ۲۱۷)

ترجمہ: ''اور جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت ہی میں مرے گا تو اس کے سارے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے، ایسے لوگ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔''

مندرجہ بالا آیت، ارتداد سے متعلق قیامت تک کے لیے ایک عام سزا بیان کرتی ہے کہ اگر کوئی شخص دین اسلام سے مرتد ہوگیا اور پھر اسی ارتداد پر مرا تو اس کے سابقہ ولاحقہ تمام اعمال باطل ہوگئے اور جان ومال بھی محفوظ نہ رہا، نکاح بھی ٹوٹ گیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں:

''یعنی دین اسلام سے پھر جانا اور اسی حالت پر اخیر تک قائم رہنا ایسی سخت بلا ہے کہ عمر بھر کے نیک کام ان کے ضائع ہوجاتے ہیں کہ کسی بھلائی کے مستحق نہیں رہتے۔ دنیا میں نہ ان کی جان ومال محفوظ رہے، نہ نکاح قائم رہے، نہ ان کو میراث ملے، نہ آخرت میں ثواب ملے اور نہ کبھی جہنم سے نجات نصیب ہو۔'' (تفسیر عثمانی: ۴۲)

قرآن مجید کی رو سے اور آیت کی تفسیر اور حکم تو یہی ہے جو لکھا گیا، نہ معلوم غامدی صاحب کے پاس کونسا قرآن ہے جس میں مرتد کے لیے کوئی خاص حکم نازل ہوا ہے۔

احادیث کے مطابق مرتد کی سزا

بخاری شریف میں حدیث ہے جو اس آیت کی تفسیر بھی ہے اور مرتد کی سزا کا واضح حکم بھی ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: ''**من بدل دینهٗ فاقتلوہ**۔'' (بخاری، باب حکم المرتد والمرتدۃ، حدیث نمبر: ۶۹۲۲) ......''جو مسلمان اپنا دین بدل دے تو اسے قتل کردو۔''

ارتداد اور مرتد کی سزا سے متعلق دوسری حدیث ملاحظہ ہو:

''**عن عبداللّٰہ رضی اللّٰه عنه قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: لا یحل دم امریء مسلم یشهد أن لا إلٰه إلا اللّٰه وأنی رسول اللّٰه إلا بإحدٰی ثلاث: النفس بالنفس والثیب الزانی والمفارق لدینه التارک للجماعة**۔'' (بخاری، باب قول اللہ تعالیٰ: ان النفس بالنفس الخ، حدیث نمبر: ۶۸۷۴۔ مسلم، کتاب القسامۃ، باب یباح بہ دم المسلم، حدیث: ۱۶۷۶)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں ماسوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسری یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو، اور تیسری یہ کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجائے۔''

اسی مضمون کی بہت ساری احادیث صحیحہ سے یہ بات ثابت ہے کہ اسلام میں مرتد شخص کی سزا قتل ہے، ان احادیث کی وجہ سے جمہور فقہاء کا بھی فتویٰ ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے، چنانچہ فقہاء اربعہ کے چند فتاویٰ لکھ دیتا ہوں، الگ الگ سارے فتاویٰ کا جمع کرنا بہت دشوار رہے۔

فقہاء اربعہ کے ہاں مرتد کی سزا قتل ہے

۱:.....مذاہب اربعہ پر لکھی گئی مستند کتاب ''**الفقه علی المذاهب الأربعة**'' میں اس کے مؤلف عبدالرحمٰن جزیری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''واتفق الائمة الأربعة رحمهم اللّٰه علٰى أن من ثبت ارتدادهٗ عن الإسلام والعياذ باللّٰه وجب قتلهٗ واهدر دمهٗ ۔'' (الفقہ علی المذاہب الاربعۃ، ج:۵،ص:۴۲۳)

''ائمہ اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص اسلام سے پھر جائے - اللہ اس سے بچائے - اس کا قتل واجب ہے اور اس کا خون رائیگاں ہے۔''

۲:.....موسوعۃ الاجماع، جلد:۱، صفحہ:۴۳۶ میں ہے:

''اتفقوا علٰى أن من كان رجلا مسلماً حراً ثم ارتد إلى دين كفرٍ انه حل دمهٗ۔''

''اس پر تمام فقہاء اسلام کا اتفاق ہے کہ آزاد مسلمان مرد اگر مرتد ہوجائے تو اس کا خون بہانا جائز ہے۔''

۳:.....اسلامی فقہ کی مشہور کتاب ''الفقه الإسلامى وأدلتهٗ'' میں ڈاکٹر وھبہ الزحیلی رحمۃ اللہ علیہ نے ''أحكام المرتد'' میں فقہاء اربعہ کا فتویٰ دلیل کے ساتھ نقل کیا ہے، لکھتے ہیں:

''اتفق العلماء علٰى وجوب قتل المرتد لقولهٖ عليه السلام: من بدل دينهٗ فاقتلوه وقولهٖ عليه السلام: لا يحل دم امرئ مسلم إلا بإحدٰى ثلاث: الثيب الزانى والنفس بالنفس والتارک لدينهٖ المفارق للجماعة وأجمع أهل العلم علٰى وجوب قتل المرتد۔'' (الفقہ الإسلامی وأدلتہ، ج:۶،ص:۱۸۶)

یعنی ''علماء نے مرتد کے قتل پر اتفاق کیا ہے اور دو صحیح حدیثوں کی وجہ سے مرتد کے قتل پر اہل علم نے اجماع کیا ہے۔'' قرآن کریم وحدیث طیبہ کی تصریحات کے بعد اور فقہاء کے اجماعی فتاویٰ کے بعد آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ جاوید احمد غامدی صاحب پر یہ فیصلے کیسے مخفی رہے ہیں؟ بس یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ غامدی صاحب نے گمراہی کا راستہ کسی غلط فہمی سے نہیں، بلکہ دیدہ ودانستہ اختیار کیا ہے۔

افسوس کا مقام ہے کہ اسی دفعہ کی اگلی عبارت میں غامدی صاحب کہتے ہیں کہ اب ارتداد کی سزا ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔ ہم غامدی صاحب سے پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ آپ کے پاس کونسی دلیل ہے کہ یہ سزا ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی؟ اور آپ کس بنیاد پر کہتے ہیں کہ یہ سزا ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی؟ کیا کوئی نئی وحی آگئی یا آسمان سے کوئی الہام ہوگیا؟ غامدی صاحب کو ذرا بھی لحاظ نہ آیا کہ وہ اتنے بڑے بڑے فقہاء اور مفسرین کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ''من بدل دينهٗ فاقتلوه'' کی حدیث کے سمجھنے میں فقہاء کو غلطی ہوگئی اور انہوں نے اس کو عام کرکے مرتد کی سزا موت قرار دی اور اس طرح اسلامی حدود وتعزیرات میں ایک ایسی سزا کا اضافہ کردیا جس کا وجود ہی اسلامی شریعت میں ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح کی گفتگو غامدی صاحب نے اپنی کتاب ''برہان'' میں کی ہے، یہاں منشور میں البتہ غامدی صاحب نے یہ لکھا ہے کہ اگر مرتد کسی فساد کا مرتکب نہیں ہوا ہے تو محض مرتد ہونے سے اس کو قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ غامدی صاحب! آپ بتائیں، ایک شخص دین اسلام کو چھوڑ کر اس کو بدنام کرتا ہے، پھر اگر ہندو بنا تو وہ

کروڑوں دیوتاؤں کو اللہ تعالیٰ کا شریک ٹھہراتا ہے، اگر یہودی اور عیسائی بنا تو اللہ تعالیٰ کے لیے بیٹا ثابت کرنے لگتا ہے، اگر مشرک بنا تو فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتا ہے اور ارتداد کے بعد اسلام کے حق میں گستاخی کرتا ہے، قرآن عظیم کو غلط کہتا ہے، کیا یہ قبیح اعمال وافعال واقوال فساد نہیں ہیں؟ اور شریعت کے مسلّمہ احکام پر اتنا بڑا حملہ کیا فساد نہیں ہے؟ ایسا لگتا ہے کہ غامدی صاحب کو تکوینی طور پر رسوا ہونا تھا جو رسوا ہو گیا:

چوں خدا خواہد کہ پردۂ کس درد میلش اندر طعنۂ پاکاں بُرد

''جب اللہ تعالیٰ کسی کا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے تو اس کا میلان نیک لوگوں کی برائی کی طرف کر دیتا ہے۔''

غامدی صاحب نے شاید اپنے ارتداد کے ارتکاب کے خوف سے یہ نیا فتویٰ اور نئی فقہ ایجاد کی، تاکہ ان کی طرف کوئی خطرہ متوجہ نہ ہو جائے، حالانکہ اصل خطرہ تو آخرت کا ہے، دنیا تو فانی جگہ ہے۔

غامدی صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ سکھوں پر لکھتے کہ ان میں جو کوئی مسلمان ہو جاتا ہے تو اس کا قتل کرنا ان کے نزدیک واجب ہے، بلکہ پانچ سال تک اگر وہ شخص دنیا کے کسی کونے میں کسی بھی سکھ کو مل جائے سکھ اس کو قتل کر سکتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں قانونِ ارتداد اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ دنیا کی فوج کا قانون دیکھ لیجئے! اگر کوئی آدمی وقت سے پہلے فوج سے ملازمت چھوڑ دیتا ہے اور بھاگ جاتا ہے تو اس کا کورٹ مارشل ہو جاتا ہے، ان سب کے لیے غامدی صاحب نے کچھ بھی نہیں لکھا، اگر لکھا تو اسلام پر لکھا کہ اس کا قانون ارتداد صحیح نہیں ہے، کسی وقت جزوی طور پر تھا، اب مکمل ختم ہو گیا ہے۔

غامدی صاحب کا نظریہ تخصیصِ احکام

جناب جاوید غامدی صاحب بڑا بننے کی پوری کوشش کرتے ہیں، اپنے آپ کو مجتہد، اسکالر اور دانشور دکھانے کے لیے ہر حربہ استعمال کرتے ہیں اور تجدد کا ہر نیا راستہ دین میں نکال لاتے ہیں، ان کا ایک خطرناک نظریہ ''تخصیص احکام'' کا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ غامدی صاحب کے نزدیک دین اسلام کے بہت سارے احکام ایسے ہیں جو رہتی دنیا کے لیے عام ضابطہ نہیں، بلکہ اسلام کے دورِ اول کی وقتی مصلحت تھی اور معاشرہ کی وقتی ضرورت تھی یا نبی اکرم ﷺ کی ذاتی حیثیت تھی یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے معروضی احوال کے پیش نظر چند احکام آئے اور پھر موقوف ہو گئے، جیسے دیت کی مقدار کا قانون احوال کے پیش نظر تھا، ارتداد کی سزا قتل اس وقت کے بنی اسماعیلؑ کے ساتھ خاص تھی، حدخمر کی سزا مخصوص انداز سے اس وقت کے ساتھ خاص تھی، نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد کسی کو کافر قرار نہیں دیا جا سکتا، معروف اور منکر کا تعین وحی نہیں، بلکہ انسانی فطرت اور خاص ماحول کرتا ہے، کفار کے خلاف جہاد وقتال اس وقت کی خاص ضرورت تھی، جہاد ہمیشہ کے لیے نہیں تھا۔ یہ اور اس قسم کے کئی احکام غامدی صاحب کے نزدیک اسلام کے دور اول کے ساتھ خاص تھے، آئندہ ادوار سے اس کا تعلق نہیں ہے۔

غامدی صاحب سے پوچھا جائے کہ نبی آخر الزمان ﷺ اور دین اسلام قیامت تک کے لیے ہے یا اس میں ردو بدل کا امکان ہے؟ اگر دین اسلام قیامت تک کے لیے ہے اور یقیناً ایسا ہی ہے تو پھر اس کے احکامات کو دورِاول کے ساتھ کیوں خاص کیا جاتا ہے؟ اور جب غامدی صاحب کا نظریہ ''تخصیص احکام'' کا بن گیا تو پھر چند احکامات کی تخصیص کیوں؟ پھر تو نبی آخر الزمان ﷺ کی نبوت کو بھی عرب اُمیین کے ساتھ خاص کر دینا چاہیے جس طرح یہود و نصاریٰ کا دعویٰ ہے، اسی طرح قرآن کریم کو بھی دور اول کے عرب کے ساتھ خاص کردو اور کہہ دو کہ عجم کی یہ زبان نہیں ہے، نمازوں کو بھی اس معاشرہ کے ساتھ خاص مانو، روزہ اور زکوٰۃ اور حج کو بھی خاص کردو اور حرام وحلال جائز و ناجائز کو بھی اس معاشرہ کی ضرورت کے ساتھ خاص کردو اور دین اسلام سے لوگوں کی چھٹی کرادو اور یہ اعلان کردو کہ اب یہ دورِ قلم کا دور ہے، مضمون نگاری اور قلم کاری کا دور ہے، دانشوری کا دور ہے، جدید دور ہے، ماڈرن دور ہے، پرانے قصے کہانیاں ختم کرنے کا دور ہے، آزادی کا دور ہے اور اِن اشعار کے پڑھنے کا دور ہے:

آزادیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹادو

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے
دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر

قانونِ شہادت سے متعلق غامدی صاحب کا نظریہ

''حدود وتعزیرات'' کے بڑے عنوان کے تحت دفعہ: ۵ کے ضمن میں قانونِ شہادت کے متعلق اپنے منشور کے ص: ۱۸ پر جناب غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ:

''شہادت کے معاملے میں بھی یہ حقیقت تسلیم کی جائے کہ حدود وتعزیرات، قصاص ودیت، مالی حقوق، نکاح وطلاق، غرض یہ کہ تمام معاملات میں یہ قاضی کی صواب دید پر ہے کہ وہ کس کی گواہی قبول کرتا ہے اور کس کی گواہی قبول نہیں کرتا، اس میں عورت اور مرد کی کوئی تخصیص نہیں ہے، عورت اگر اپنے بیان میں اُلجھے بغیر واضح طریقے پر گواہی دیتی ہے تو اسے محض اس وجہ سے رد نہیں کردیا جائے گا کہ اس کے ساتھ کوئی دوسری عورت یا مرد نہیں ہے اور مرد کی گواہی میں اگر اضطراب وابہام ہے تو اسے محض اس وجہ سے قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ مرد ہے، عدالت اگر گواہوں کے بیانات اور دوسرے قرائن وحالات کی بنا پر مطمئن ہوجاتی ہے کہ مقدمہ ثابت ہے تو وہ لامحالہ اسے ثابت قرار دے گی اور وہ اگر مطمئن نہیں ہوتی تو اسے یہ حق بے شک حاصل ہے کہ وہ دس مردوں کی گواہی کو بھی قبول کرنے سے انکار کردے۔ (منشور: ص: ۱۸)

تبصرہ:..... غامدی صاحب نے اپنے منشور کی مذکورہ عبارت میں واضح طور پر مسلمانوں کے سارے اسلامی احکام اور معاملات کو ججوں کے حوالے کردیا ہے اور ججوں کو کسی شریعت وقانون کا پابند

www.banuri.edu.pk

نہیں رکھا، بلکہ سب کچھ ان کی صواب دید پر چھوڑ دیا ہے کہ جج جو کچھ کرنا چاہتا ہے اس کو مکمل اختیار ہے کہ کسی کی گواہی قبول کرے یا رد کرے، گواہ عورت ہو یا مرد ہو کوئی فرق نہیں ہے، یہ غامدی صاحب کی بہت بڑی گمراہی ہے، اس طرح اس نے شریعت مقدسہ کے اصول وقواعد کو معطل کر کے پارہ پارہ کردیا ہے، حالانکہ قاضی مسلمانوں کے اسلامی حاکم کی طرف سے شریعت کے اسلامی فیصلوں پر مقرر ہوتا ہے اور شریعت کے ہر ضابطے کا پابند ہوتا ہے، اس کا منصب اتنا حساس ہے کہ وہ غصہ کی حالت میں یا قضاء حاجت کی ضرورت کی حالت میں یا بھوک و پیاس کی حالت میں فیصلہ نہیں سنا سکتا ہے، کیونکہ ان احوال میں اس کی گرفت شرعی مسئلہ پر مضبوط نہیں ہوتی ہے، مبادا غلط فیصلہ نہ کر بیٹھے، قاضی کو شریعت نے قطعاً آزاد نہیں چھوڑا ہے کہ وہ اپنی صواب دید پر فیصلے سنایا کرے، بلکہ اس کو سب سے پہلے قرآن، پھر سنت، پھر اجماعِ امت کے فیصلوں کا پابند بنایا ہے، چنانچہ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت اس طرح ہے:

’’عن معاذ بن جبل رضی اللّٰہ عنه أن رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم لما بعثهٗ إلی الیمن قال: کیف تقضی إذا عرض لک قضاء؟ قال: أقضی بکتاب اللّٰہ، قال: فإن لم تجد فی کتاب اللّٰہ؟ قال فبسنة رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم، قال: فإن لم تجد فی سنة رسول اللّٰہ؟ قال أجتهد برائی ولا آلُو، قال: فضرب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیه وسلم علٰی صدرہٖ وقال: الحمد للّٰہ الذی وفق رسولَ رسولِ اللّٰہ لما یرضٰی به رسولُ اللّٰہ۔‘‘ (رواہ الترمذی، باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی، ج:۳،ص:۶۱۶، ط: دار احیاء التراث العربی، بیروت)

’’حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو (قاضی بناکر) یمن بھیجا تو ان سے پوچھا کہ جب تمہارے سامنے کوئی قضیہ پیش ہوگا تو تم کس طرح فیصلہ کروگے؟ انہوں نے کہا کہ: میں کتاب اللہ کے موافق فیصلہ کروں گا، آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: تمہیں اگر وہ مسئلہ (صراحۃً) کتاب اللہ میں نہ ملا؟ انہوں نے فرمایا کہ پھر سنت رسول اللہ (حدیث نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے مطابق فیصلہ کروں گا، فرمایا کہ: اگر تمہیں وہ مسئلہ سنت رسول اللہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) میں بھی (صراحۃً) نہ ملا؟ انہوں نے کہا کہ پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور اس میں کوتاہی نہیں کروں گا، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: آنحضرت ﷺ نے اپنا دست مبارک اُن کے سینے پر مارا اور فرمایا: تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ (ﷺ) کے قاصد (معاذ رضی اللہ عنہ) کو اس چیز کی توفیق عطا کی جس سے اللہ کا رسول (ﷺ) راضی ہوا۔‘‘

اس حدیث سے قاضیوں کے فیصلوں کا مأخذ معلوم ہوا جس سے ظاہر ہوا کہ قاضی کی اپنی کوئی صواب دید نہیں ہے، وہ اپنے فیصلوں میں قرآن وسنت اور اس کی روشنی میں صحیح اجتہاد اور اجماعِ امت کا پابند ہے، غامدی صاحب نے غلط کہا ہے اور غلط لکھا ہے، اب چند حدیثوں کا ترجمہ نقل کرتا ہوں، تاکہ معلوم ہوجائے کہ حق کو چھوڑ کر قاضی نے اگر غلط فیصلہ کیا تو دوزخ میں جائے گا۔

۱:.....حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص مسلمانوں کے منصب قضاء کا طالب اور خواستگار رہوا، یہاں تک کہ اس نے اس کو حاصل بھی کرلیا اور پھر اپنے فرائض منصبی میں اس کا عدل وانصاف ظلم پر غالب رہا تو وہ جنت کا مستحق ہوگا اور جس قاضی کا ظلم اس کے عدل وانصاف پر غالب رہا تو وہ دوزخ کا سزاوار ہوگا۔ (ابوداود، باب فی القاضی یخطئ، ج:۳، ص:۳۲۵، ط: دارالکتاب العربی، بیروت)

۲:.....حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا کہ: قاضی تین قسم کے ہوتے ہیں، ایک قسم کے تو جنت میں جائیں گے اور دو قسم کے دوزخ میں جائیں گے، پس جنت میں جانے والا تو وہ قاضی ہے جس نے حق کو پہچانا اور پھر حق ہی کے مطابق فیصلہ کیا اور جس نے حق کو پہچانا مگر اپنے فیصلے میں حق سے تجاوز کیا وہ دوزخ میں جائے گا اور جس نے جہالت کی وجہ سے حق کو نہیں پہچانا اور پھر بھی لوگوں کے تنازعات میں (غلط) فیصلہ کیا، وہ بھی دوزخ میں ہے۔'' (ابوداود، باب فی القاضی یخطئ، ج:۳، ص:۳۲۴، ط: دارالکتاب العربی، بیروت)

۳:.....ایک اور حدیث میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: جو شخص لوگوں کے درمیان قاضی مقرر کیا گیا (گویا) اس کو بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔ (ترمذی، باب ماجاء عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی القاضی، ج:۳، ص:۶۱۴، ط: داراحیاء التراث العربی، بیروت)

ان تمام احادیث سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ قاضی اپنے فیصلوں میں خودمختار نہیں ہوتا، بلکہ وہ شریعت کے قواعد کا پابند ہوتا ہے، اگر اس نے پابندی نہیں کی اور غلط فیصلے کیے تو دوزخ میں جائے گا، اگر حقیقت یہی ہے اور یقیناً یہی ہے تو غامدی صاحب کا یہ کہنا غلط ہے کہ تمام معاملات قاضی کی صواب دید پر ہیں، وہ کسی کی گواہی قبول کرے یا نہ کرے، وہ اس ضابطہ کی پابندی بھی نہ کرے کہ گواہی دینے والا مرد ہے یا عورت ہے، پھر ایک عورت ہے یا دو ہیں، ایک مرد ہے یا دس ہیں، بلکہ خود قاضی کا مطمئن ہونا کافی ہے۔ گویا غامدی صاحب کے نزدیک شریعت کا کوئی ضابطہ اور قانون نہیں ہے، پوری شریعت قاضی کے تابع ہے، قاضی شریعت کا تابع نہیں ہے۔ اس طرح غامدی صاحب نے اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کو قاضیوں اور ججوں کے حوالہ کردیا ہے کہ وہ جو کچھ کریں، ان کی مرضی ہے۔ اوپر منشور کی ظاہری عبارت یہی ہے جو سب کے سامنے ہے۔ غامدی صاحب کے دل کو ہم نہیں جانتے کہ اس کے دل میں کیا ہے، عبارت کی روشنی میں تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غامدی صاحب شریعت سے منحرف اور پکا گمراہ ہے۔ فقہاء کرام نے تعزیرات میں بے شک قاضیوں کی صواب دید کی بات کی ہے، لیکن غامدی صاحب تو تعزیرات کے بالکل منکر ہیں، وہ برہان میں لکھتے ہیں:

''یہ ایک بے معنی بات ہے کہ جرم کے ثبوت اور عدم ثبوت کے درمیان کوئی حالت مانی جائے اور پھر یہ کہا جائے کہ جرم اگر اتنا ثابت ہو تو حد اور اتنا ثابت ہو تو اس پر تعزیر جاری کی جائے گی، عقل سلیم پوری شدت کے ساتھ اسے رد کرتی ہے۔'' (برہان، ص:۳۴)

اسی دفعہ کی اگلی عبارت میں غامدی صاحب نے ایک نیا گمراہ کن شوشہ چھوڑا کہ مرد اور عورت کی گواہی میں تعداد کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے، ایک مرد اور دو عورتوں کو مساوی بنانا اور عورت کی گواہی مردوں کے مقابلے میں نصف بتانا یہ ہمارے فقہاء کی غلطی ہے، چنانچہ ان کی کتاب برہان میں اس کی وضاحت ہے، وہ پہلے سورۂ بقرہ کی اس آیت کو ذکر کرتے ہیں جس میں مرد اور عورت کی گواہی میں فرق ہے اور پھر اس آیت میں تحریف اور باطل تاویل کرتے ہیں، آیت یہ ہے:

''وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرٰى۔'' (البقرۃ:۲۸۲)

ترجمہ: ''اور گواہ کرو دو شاہدا اپنے مردوں میں سے، پھر اگر نہ ہوں دو مرد تو ایک مرد اور دو عورتیں ان لوگوں میں سے کہ جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں، تا کہ اگر بھول جائے ایک (عورت) ان میں سے تو یاد دلا دے اس کو دوسری۔''

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ترجمہ کے بعد اس آیت کی مختصر تفسیر میں اس طرح فرماتے ہیں: ''اور تم کو چاہیے کہ اس معاملہ پر کم سے کم دو گواہ مردوں میں سے یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں اور گواہ قابل پسند یعنی لائق اعتبار اور اعتماد ہوں۔'' (تفسیر عثمانی، ص:۶۱)

قرآن عظیم کی یہ واضح آیت ہے جس میں مرد اور عورت کی گواہی کا معیار بیان ہوا ہے، تمام مفسرین نے اس کی تفسیر میں کوئی شک نہیں کیا اور نہ اس میں شقیں بنا کر اس فرق کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے، نہ محدثین نے مردوں اور عورتوں کی گواہی کے اس فرق کا انکار کیا ہے اور نہ فقہاء کرام نے شہادت کے اس نصاب پر کلام کیا ہے، آخر میں غامدی صاحب تشریف لائے تو انہوں نے مغرب اور یورپ کو خوش کرنے کے لیے ان واضح آیات میں اگر چہ مگر چہ اور ایں چنیں و آں چناں شروع کر دیا اور باطل تاویلیں اختیار کیں اور فقہاء کرام پر ناسمجھی کا فتویٰ لگا دیا اور کہا کہ اس آیت سے فقہاء کا استدلال ہمارے نزدیک دو وجوہ سے محل نظر ہے، ایک یہ کہ واقعاتی شہادت کے ساتھ اس آیت کا سرے سے کوئی تعلق ہی نہیں، یہ دستاویزی شہادت سے متعلق ہے۔ (برھان: ص:۲۹)

تبصرہ: .....سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ غامدی کون ہے اور اس کے ''نزدیک'' کیا ہے؟ جو لکھتا ہے کہ ''ہمارے نزدیک''۔ بھائی غامدی صاحب!!! آپ اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ آپ کی الگ فقہ ہو اور آپ کی تمام امت کے برعکس کوئی قابل احترام رائے ہو، علماء اور فقہاء کی تفسیر وتحقیق کی اتباع کرو، اس پر چلو، بھلائی اسی میں ہے، کیونکہ فقہاء کرام کی تحقیق قرآن وحدیث کے عین مطابق ہے، غلطی آپ کی ہے، فقہاء کو غلط نہ کہو، شاعر نے کہا:

چوں بشنوی سخنِ اہل دل مگو کہ خطاً است
سخن شناس نہ ای جانِ من! خطاً ایں جا است

یعنی جب اہل اللہ علماء وفقہاء کی بات سنو تو یہ نہ کہو کہ یہ غلط ہے، میرے پیارے! بزرگوں کی بات نہ سمجھنا ہی آپ کی بڑی غلطی ہے۔ غامدی صاحب نے یہاں آیت میں یہ تاویل کی ہے کہ اس شہادت کا تعلق دستاویزی شہادت سے ہے، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ دستاویزی شہادت ہو یا واقعاتی شہادت کی آپ کی منطق ہو، آخر کار مقدمہ تو عدالت ہی کے پاس جائے گا، وہ وہاں جانچ پڑتال کرے گی کہ نصاب شہادت قرآن وحدیث کے مطابق مکمل ہے یا مکمل نہیں ہے؟ جب معاملہ ایسا ہے تو غامدی صاحب الگ الگ شقیں بنانے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں؟ اور اگر چہ مگر چہ اور ایں چنیں اور آں چناں سے کام کیوں لے رہے ہیں؟ غامدی صاحب دوسری تاویل کر کے لکھتے ہیں کہ: آیت کے موقع ومحل اور اسلوبِ بیان میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اسے قانون وعدالت سے متعلق قرار دیا جائے، اس میں عدالت کو مخاطب کر کے یہ بات نہیں کہی گئی کہ اس طرح کا کوئی مقدمہ اگر پیش کیا جائے تو مدعی سے اس نصاب کے مطابق گواہ طلب کرو۔ (برہان، ص: ۳۰)

تبصرہ:..... میں غامدی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اس آیت میں قرآن مجید کی مخاطب اگر عدالت نہیں ہے تو آپ ہمیں بتائیں وہ کون لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ شرعی قضاء کا حکم دے رہا ہے؟ اور پھر نصابِ شہادت کی رہنمائی فرما رہا ہے؟ کیا غامدی صاحب نے اس سے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ ان کے دفتر اور آفس کا معاملہ ہے؟ غور کرو! یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جس کا تعلق خالص عدالت سے ہے، گواہوں کی بات ہے، قاضیوں کو حکم ہے اور پھر نصاب شہادت کے پورا ہونے کی بات ہے، اگر مردوں سے یہ نصاب پورا نہیں ہوتا ہے تو پھر دو عورتوں سے اس نصاب کو پورا کیا گیا ہے، پھر اس کی وجہ بھی بتلائی گئی ہے کہ دو عورتیں ایک مرد کے مساوی کیوں ہیں، اس میں عورت کی تخلیقی کمزوری کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے، جس کی پوری تفصیل بخاری ومسلم کی اس حدیث میں موجود ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے عورتوں کو ناقصات عقل قرار دیا تو عورتوں میں سے ایک ہوشیار عورت کھڑی ہوگئی اور اس نے اس کی وجہ پوچھی تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: کیا دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر نہیں ہے؟ عورتوں نے کہا: ہاں! اسی طرح ہے، تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ: یہ ان کی عقل کی کمزوری کی دلیل ہے۔ میں جناب غامدی صاحب سے کہوں گا کہ خدا نہ بنو، خدا کے بندے بنو، رسول نہ بنو رسول کے امتی بنو، مجتہد نہ بنو مجتہد کے مقلد بنو، دسیوں پریشانیوں سے نجات پالو گے، زیادہ بلند پرواز نہ رکھو، کہیں زیادہ بلندی سے گر نہ جاؤ۔

قدر لرجلک قبل الخطو موضعها
فمن علا زلقا عن غرة زلجا
اپنی مٹی پہ ہی چلنے کا سلیقہ سیکھو
سنگ مرمر پہ چلو گے تو پھسل جاؤ گے

(جاری ہے)

رسول اللہ ﷺ کی تاریخِ ولادت

افادات: مفتی رضاء الحق، جنوبی افریقہ

تحقیق وترجیح (روایةً ودرایةً)

ترتیب وتخریج: مولانا اویس گودھروی، ڈابھیل، انڈیا

محققین کے نزدیک آپ ﷺ نو (۹) ربیع الاول کی ابتدا میں پیدا ہوئے، جو شمسی لحاظ سے ۲۰/اپریل ۵۷۱ء کا دن تھا۔ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ آپ ﷺ ربیع میں پیدا ہوئے اور موسمِ ربیع ایشیاء میں اپریل کے مہینہ میں آتا ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اپریل کا مہینہ تھا۔ کسی نے آپ ﷺ کی ولادت کا ربیع میں ہونا یوں بیان کیا ہے:

یقول لنا لسانُ الحال منه　　وقول الحق یَعذُب للسمیع

فوجهي والزمان وشهر وضعي　　ربیع فی ربیع فی ربیع

(شرح الزرقانی علی المواہب، ج:۱،ص:۲۵۷۔ سبل الہدیٰ والرشاد، ج:۱،ص:۳۳۴)

تحقیقِ تاریخ ولادت

سال:..... یہ بات مسلّم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت عام الفیل میں ہوئی تھی، اس پر سب ہی مؤرخین وسیرت نگار متفق ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ:۷۷۴ھ) فرماتے ہیں:

”قال ابن إسحاق: وكان مولدهٗ صلی اللّٰه علیه وسلم عام الفیل، وهذا هو المشهور عند الجمهور۔“ (البدایۃ والنہایۃ، ج:۲،ص:۳۲۱)

علامہ ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ:۵۹۷ھ) فرماتے ہیں:

”واتفقوا علٰی أن رسول اللّٰه – صلی اللّٰه علیه وسلم – ولد یوم الإثنین فی شهر ربیع الأول عام الفیل۔“ (صفۃ الصفوۃ، ج:۱،ص:۵۱۔ وینظر: الروض الأنف، ج:۱،ص:۲۷۶)

واقعۂ فیل کے کتنے دنوں بعد آپ ﷺ کی ولادت ہوئی؟ اس بارے میں متعدد اقوال ہیں، مگر مشہور قول ۵۰/دن کا ہے:

”ولد عام الفیل ... فقیل: بعدهٗ بشهر ... وقیل: بخمسین یوما، وهو أشهر۔“ (البدایۃ والنہایۃ۲/۳۲۱)

مہینہ:..... اس سلسلہ میں علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ:۹۲۳ھ) نے چھ اقوال نقل فرمائے

ہیں: ۱:....محرم، ۲:....صفر، ۳:....ربیع الاول، ۴:....ربیع الآخر، ۵:....رجب، ۶:....رمضان، مگر جمہور کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت ماہِ ربیع الاول میں ہوئی۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''ثم الجمهور علی أنه کان فی شهر ربیع الأول۔'' (البدایۃ والنہایۃ، ج:۲،ص:۳۲۰)

ابھی ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت گزری، اس میں بھی ربیع الاول کی تعیین پر اتفاق نقل کیا گیا ہے۔

مشہور محقق عالم علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ ولادت پر اچھی تحقیق فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ربیع الاول کے علاوہ کسی اور مہینہ کا قول علمائے ناقدین کے نزدیک سبقتِ قلم کی قبیل سے ہے:

''وقد اتفق جمهرة النقلة علی أن مولدهٗ کان عام الفیل، وأنهٗ کان یوم الإثنین، وأن شهر مولدهٖ هو شهر ربیع الأول، وذکرُ شهرٍ سواه لمولدهٖ علیه السلام لیس إلا من قبیل سبق القلم عند النقاد۔'' (مقالات الکوثری،ص:۴۰۵)

دن:.....اس بات پر بھی اربابِ سیر وتاریخ کا اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت پیر کے دن ہوئی۔

''وفي الحدیث: وسئل رسول الله صلی الله علیه وسلم عن یوم الاثنین؟ قال: ذاک یوم ولدت فیه، ویوم بعثت...'' (صحیح مسلم، رقم:۱۱۶۲، باب استحباب ثلاثۃ أیام من کل شہر)

''وقال ابن کثیر رحمه الله تعالٰی: وهذا ما لا خلاف فیه أنهٗ ولد صلی الله علیه وسلم یومَ الإثنین۔'' (البدایۃ والنہایۃ، ج:۲،ص:۳۱۹)

تاریخ:.....ماہِ ربیع الاول کی کونسی تاریخ میں آپ ﷺ کی پیدائش ہوئی تھی؟ اس کے متعلق بعض علماء کا کہنا ہے کہ ربیع الاول میں پیر کے دن ہوئی، مگر تاریخ کا تعین نہ ہوسکا، جب کہ جمہور فرماتے ہیں کہ تاریخ متعین ہے، پھر وہ کونسی تاریخ تھی؟

علامہ قسطلانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۹۲۳ھ) نے اس سلسلہ میں کل سات اقوال نقل فرمائے ہیں:

۱:.....ربیع الاول کی دوسری، ۲:.....آٹھویں، ۳:.....دسویں، ۴:.....بارھویں، ۵:.....سترھویں، ۶:.....اٹھارھویں، ۷:.....بائیسویں۔ (المواہب اللدنیۃ، ج:۱ ص:۱۴۰-۱۴۲)

علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:۱:....آٹھویں تاریخ ختم ہونے کے بعد یعنی نویں تاریخ، ۲:.....دسویں تاریخ، ۳:.....بارھویں تاریخ۔ ان تین اقوال کے علاوہ دیگر چار اقوال مستند اور قوی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے قابل التفات نہیں۔ تو اب کل بحث کا محور انہی تین روایات میں سے راجح کی ترجیح ہے۔

دسویں تاریخ کی روایت

اس روایت کو ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۱۶۸ھ) نے محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۱۱۴ھ) کی طرف منسوب کیا ہے، لیکن اس کی سند میں تین رواۃ متکلم فیہ ہیں، اس لیے دس تاریخ والی روایت قابلِ ترجیح نہیں ہے۔ اس روایت کی طرف علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے اشارہ فرمایا ہے، وہ روایت طبقات سے نقل کی جاتی ہے:

''قال ابن سعد : أنا محمد بن عمر بن واقد الأسلمی قال: ثني أبو بکر بن عبد الله

بن أبي سبرة عن إسحاق بن عبد اللّٰه بن أبي فروة عن أبى جعفر محمد بن علی (ويعرف بمحمد الباقر) قال: ولد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لِعشرٍ خَلَون من شهر ربيع الأول...، فبين الفيل وبين مولد النبي صلى اللّٰه عليه وسلم خمس وخمسون ليلة۔'' (الطبقات الکبریٰ لابن سعدؒ، ج:۱،ص:۱۰۰، ذکر مولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم)

بارہویں تاریخ کی روایت

اس قول کو محمد بن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ:۱۵۱ھ) نے نقل کیا ہے، مگر اس کی کوئی سند نہیں بیان کی، اگرچہ یہ قول سب سے زیادہ مشہور ہے اور دنیا بھر میں محافلِ مولود اور جلسے اسی دن کیے جاتے ہیں، مگر روایت سے اس دن ولادت ہونے کا ثبوت نہیں۔ ملاحظہ فرمائیں: مستدرکِ حاکم (متوفیٰ:۴۰۵ھ) میں ہے:

''أخبرنا أبو الحسن محمد بن أحمد بن شبويه بمرو، ثنا جعفر بن محمد النيسابوری، ثنا علی بن مهران، ثنا سلمة بن الفضل عن محمد بن إسحاق قال: ولد رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم لاثنتى عشرة ليلة مضت من شهر ربيع الأول۔'' (المستدرک علی الصحیحین للحاکم، رقم الحدیث:۴۱۸۳)

یہ روایت بھی سندِ متصل نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ التفات نہیں اور اس کا حال بھی ان روایات کی طرح ہے جن کی سند نہ ہو۔

نویں تاریخ کے قول کی ترجیح

عقلاً اور نقلاً اس بات کو ترجیح حاصل ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت آٹھویں تاریخ کے ختم پر نویں تاریخ کو ہوئی۔

روایتاً ترجیح

۱:..... علامہ ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ:۴۶۳ھ) نے اس بارے میں اختلاف نقل کرتے ہوئے اس قول کو سب سے پہلے ذکر کیا ہے:

''قال أبو عمر: وقد قيل: لثمانٍ خلون منه، وقيل ...، وقيل...'' (الاستیعاب لابن عبدالبر:۱/۳۰)

۲:.....حافظ ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''وقيل: لثمانٍ خلون منه، حكاه الحميدي عن ابن حزم، ورواه مالك وعقيل ويونس بن يزيدٍ وغيرهم عن الزهری عن محمد بن جبير بن مطعم، ونقل ابن عبد البر عن أصحاب التاريخ أنهم صحّحوه، وقطع به الحافظ الكبير محمد بن موسى الخوارزمی، ورجّحه الحافظُ أبو الخطاب بن دحية فى كتابه ''التنوير فى مولد البشير النذير ﷺ۔'' (البدایۃ والنہایۃ، ج:۲،ص:۳۲۰)

۳:...... حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ:۱۳۸۲ھ) تحریر فرماتے ہیں: عوام میں تو مشہور قول یہ ہے کہ ۱۲ر ربیع الاول تھی، اور بعض کمزور روایات اس کی پشت پر ہیں، اور

اکثر علماء ۸؍ربیع الاول کہتے ہیں۔ لیکن صحیح اور مستند قول یہ ہے کہ ۹؍ربیع الاول تاریخ ولادت ہے، اور مشاہیر علمائے تاریخ اور حدیث اور جلیل المرتبت ائمۂ دین اسی تاریخ کو صحیح اور اثبت کہتے ہیں، چنانچہ حمیدی، عقیل، یونس بن یزید، ابن عبد اللہ، ابن حزم، محمد بن موسی خوارزمی، ابو الخطاب ابن دحیہ، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن کثیر، ابن حجر عسقلانی، شیخ بدر الدین عینی (رحمہم اللہ اجمعین) جیسے مقتدر علماء کی یہی رائے ہے۔ (قصص القرآن، ج:۴،ص:۲۵۳)

۴:.....علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی نو (۹) تاریخ کو ولادت ہونا راجح قرار دیا ہے۔ (رحمت للعالمین، ج:۱،ص:۳۸-۳۹)

درایتاً/عقلاً ترجیح

۱:.....محمد بن موسی خوارزمی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۲۳۵ھ) فلکیات کے بہت بڑے امام ہیں، ان کا حوالہ ابھی اوپر کی عبارت میں ذکر کیا گیا۔

۲:.....فن ریاضی کے بہت بڑے عالم علامہ محمود پاشا فلکی مصری رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۱۳۰۲ھ) نے فرانسیسی زبان میں ''**تقویم العرب قبل الإسلام**'' کے موضوع پر ایک بے مثال کتاب تالیف فرمائی ہے، اور علامہ احمد ذکی پاشا رحمۃ اللہ علیہ (متوفی:۱۳۵۳ھ) نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا ہے، جس کا نام ''**نتائج الأفهام فی تقویم العرب قبل الإسلام وفی تحقیق مولد النبی وعمرہٖ علیه الصلاة والسلام**'' ہے۔ اس کتاب میں مشرق اور مغرب کے کئی ایک فلکی ماہرین کے اقوال کو مدنظر رکھ کر کی گئی تحقیق سے بھی نو (۹) تاریخ ہونا واضح ہے۔ (نتائج الأفہام،ص:۲۸-۳۵)

ان کی بیان کردہ وجوہات میں سے ایک وجہ کچھ اس طرح ہے کہ:

رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں سنہ ۱۰ھ ماہِ شوال کی آخری تاریخ کو سورج گہن ہوا تھا، اُسی دن آپ ﷺ کے صاحبزادہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تھا:

''**قال الحافظ (م:۸۵۲ھ): یوم مات إبراهیم رضی اللہ عنہ یعنی ابنَ النبی صلی اللّٰہ علیه وسلم، وقد ذکر جمهور أهل السیر أنه مات فی السنة العاشرة من الهجرة، فقیل: ... والأکثر علٰی أنها وقعت فی عاشر الشهر۔**'' (فتح الباری، ج:۲،ص:۵۲۹)

اس حساب سے اگر پیچھے شمار کیا جائے تو ربیع الاول کی نویں تاریخ کو آپ ﷺ کی ولادت بابرکت ہونا ثابت ہوگا، اس لیے کہ پیر کا دن یومِ پیدائش ہونا تو متفق علیہ ہے، اور وہ عام الفیل کے ربیع الاول میں نو (۹) تاریخ ہی کو آتا ہے۔ علامہ محمود پاشا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''**وقد اتفقوا جمیعا علی أن الولادة کانت فی یوم الإثنین، وحیث إنه لا یوجد بین الثامن والثانی عشر من هذا الشهر یوم إثنین سوی الیوم التاسع منه، فلا یمکن أن نعتبر یوم الولادة خلاف هذا الیوم۔**''

حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

’’محمود پاشا فلکیؒ نے (جو قسطنطنیہ کا مشہور ہیئت داں اور منجم گزرا ہے) ہیئت کے مطابق جو زائچہ اس غرض سے مرتب کیا تھا کہ محمد ﷺ کے زمانے سے اپنے زمانے تک کے کسوف اور خسوف کا صحیح حساب معلوم کرے، پوری تحقیق کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سنِ ولادت باسعادت میں کسی حساب سے بھی دوشنبہ کا دن ۱۲؍ ربیع الاول کو نہیں آتا، بلکہ ۹ ربیع الاول ہی کو آتا ہے، اس لیے بلحاظِ قوت وصحتِ روایات اور باعتبارِ حسابِ ہیئت ونجوم ولادت مبارکہ کی مستند تاریخ ۹؍ ربیع الاول ہے۔ (قصص القرآن، ج:۴، ص:۲۵۳)

۳:.....مذکورہ بالا کتاب ’’نتائج الأفهام فی تقويم العرب قبل الإسلام وفی تحقيق مولد النبي وعمره عليه الصلاة والسلام‘‘ کے ایک ایڈیشن پر اپنے زمانے کے عظیم ونامور مؤرخ وادیب شیخ علی طنطاویؒ (متوفیٰ: ۱۴۲۰ھ) نے مقدمہ لکھا ہے، جس میں آپ نے نو (۹) ربیع الاول کو ولادت باسعادت کا دن قرار دینے پر مؤلفِ کتاب کی پرزور تائید فرمائی ہے۔ (مقدمات الطنطاوی، ص:۸۳)

۴:.....محدثِ عظیم ومحققِ بےنظیر شیخ احمد شاکر (احمد بن محمد عبدالقادر، متوفی: ۱۳۷۷ھ) نے بھی شیخ محمود پاشا فلکی کی تحقیق کو اختیار کرکے اس سے کسوفِ شمس کی تعیین میں مدد لی ہے۔ (حاشیۃ الشیخ احمد شاکر علی ’’المحلّٰی بالآثار‘‘ ج:۵، ص:۱۱۴-۱۱۵، لابن حزم الظاہری، متوفی: ۴۵۶ھ)

۵:.....سعودی عرب کے ایک محقق وماہرِ فلکیات عالم عبد اللہ بن محمد بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ: ۱۴۱۶ھ) اپنی کتاب ’’تقويم الأزمان‘‘ میں تحریر فرماتے ہیں:

’’وقد ثبت بما لا يحتمل الشک من النقل الصحيح أن ولادته -صلى الله عليه وسلم- كانت فی ۲۰؍ نيسان ابريل سنة ۵۷۱ء عام الفيل ... فبالإمكان معرفة يوم ولادته ويوم وفاته بالدقة ... وعلٰى هذا فتكون ولادته -صلى الله عليه وسلم- يوم الإثنين، الموافق ۹ ربيع الأول سنة ۵۳ قبل الهجرة ويوافق ۲۰؍ نيسان ابريل سنة ۵۷۱ء نقلا وحساباً۔‘‘

(تقویم الأزمان لإرشاد ذوی الألباب لمعرفۃ مبادئ السنین والشہور من طریق الحساب، ص:۱۴۳، الطبعۃ الأولی)

مزید دیکھئے! ۱:.....ایک مفصل مضمون بعنوان ’’تحديد ميلاده الشريف‘‘ ہمارے یہاں موجود کتاب ’’ماشاع ولم يثبت فی السيرة النبوية‘‘ تألیف: محمد بن عبداللہ العوشن، ط: دار طیبۃ، الریاض میں بھی مذکور ہے، جس میں شیخ عبداللہ بن محمد بن ابراہیم کی مذکورہ عبارت کے علاوہ دیگر علمائے کرام کے اقوال کی روشنی میں ۹؍ تاریخ ہونا راجح قرار دیا ہے۔

۲:.....علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ: ۱۳۷۱ھ) کا ایک مختصر اور محقق مقالہ بعنوان ’’المولد الشريف النبوی‘‘ اس موضوع پر شائع ہوا ہے۔ انہوں نے بھی محمود پاشا فلکیؒ کی مذکورہ کتاب سے استفادہ کیا ہے اور مؤلف کے بارے میں اونچے کلمات تحریر فرمائے ہیں۔ (دیکھئے: مقالات الکوثری، ص:۴۰۵ تا ۴۰۸، ط: مطبعۃ الأنوار بالقاہرۃ)

۳:.....حضرت مولانا مفتی عمر فاروق لوہاروی دامت برکاتہم، شیخ الحدیث دارالعلوم لندن (یو-کے) کا ایک مضمون بعنوان ''رسول اللہ ﷺ کی تاریخِ ولادت'' ان کے بیش قیمت محقق و مدلل رسائل ''فقہی جواہر'' (ج:۱،ص:۶۸ تا ۷۱) میں موجود ہے۔ ان رسائل پر اکابر علماء کی تقریظات ہیں، جن میں ایک حضرت مفتی سعید احمد صاحب پالن پوری دامت برکاتہم بھی ہیں۔

تنبیہ:.....بعض علماء نے آٹھویں تاریخ کا قول اختیار کیا ہے، تو یاد رہے کہ آٹھویں اور نویں تاریخ کے دو اقوال میں ترجیح دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایک تطبیق حضرت مولانا حفظ الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، وہ یہ ہے کہ آٹھ (۸) اور نو (۹) ربیع الاول کا اختلاف حقیقی نہیں۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''۸ اور ۹ کا اختلاف حقیقی اختلاف نہیں، بلکہ مہینے کے ۲۹ اور ۳۰ کے حساب پر مبنی ہے، اور جب کہ حساب سے ثابت ہو گیا کہ صحیح تاریخ ۲۱/ اپریل تھی تو آٹھ (۸) کے متعلق تمام اقوال دراصل نو (۹) کی تائید میں پیش ہو سکتے ہیں۔'' (قصص القرآن، ج:۴،ص:۲۵۴)

وقت:.....کتبِ سیرت میں اس بات کی صراحت ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت صبح صادق کے وقت ہوئی، اور مکہ مکرمہ میں ۲۰/ اپریل کو (۴:۳۹) پر صبح صادق ہوتی ہے، اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ ۹/ ربیع الاول عام الفیل، ۲۰/ اپریل ۵۷۱ء بروز پیر، بوقت صبح تقریباً ۴ بج کر ۴۰ منٹ پر اس دنیا میں تشریف لائے۔

مذکورہ بالا تفصیلات کا حاصل یہ ہے کہ نقلاً وعقلاً آپ ﷺ کی ولادت کی معتمد تاریخ نو (۹) ربیع الاول ہے۔

''ويتلخص من هذا أن سيدنا محمدا صلى الله عليه وسلم ولد يوم الإثنين ۹/ من ربيع الأول، الموافق العشرين من إبريل سنة ۵۷۱ مسيحية، فاحرص على هذا التحقيق، ولا تكن أثيراً للتقليد۔'' (نتائج الأفهام فی تقويم العرب قبل الإسلام، ص:۳۵)

مکانِ ولادت

جمہور کے نزدیک مکہ مکرمہ میں ولادت ہوئی۔ پھر جگہ کی تعیین میں تین اقوال ہیں: مشہور قول یہ ہے کہ آپ ﷺ کی ولادت شعبِ بنی ہاشم میں ہوئی۔ یہ مشہور جگہ ہے اور چند سال پہلے تک لوگ اس کی زیارت کے لیے جایا کرتے تھے۔ چند سال پہلے سعودی حکومت نے اسے بند کر دیا اور اس کی جگہ مکتبہ بنا دیا۔

''في الدار التي في الزقاق المعروف بزقاق المولد في شعب مشهور بشعب بني هاشم۔'' (سبل الهدى والرشاد، ج:۱،ص:۳۳۸)

''من الطرف الشرقي لمكة، تزار ويتبرك بها إلى الآن۔''

(تاريخ الخميس فی أحوال أنفس النفيس، ج:۱،ص:۱۹۸)

والله تعالىٰ أعلم وعلمهٗ أتم وأحكم، وصلى الله على النبي الأمي الكريم وعلى آله وصحبه أجمعين

۶۳ رسالہ حیاتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کی ایک جھلک

مفتی محمد راشد ڈسکوی

سیدنا ومولانا حضرت محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ کی ولادت باسعادت پیر کے روز صبح صادق کے وقت ربیع الاول، عام الفیل مطابق اپریل ۵۷۱ء میں ہوئی، آپ ﷺ کی ولادت سے چند مہینے پہلے آپ ﷺ کے والد محترم ''عبد اللہ'' کی وفات ہوگئی، آپ ﷺ کے دادا جان ''عبد المطلب'' کی طرف سے آپ ﷺ کا اسم گرامی ''محمد'' ہے، اور آپ ﷺ کی والدہ محترمہ ''آمنہ'' کی طرف سے آپ ﷺ کا نام ''احمد'' تجویز ہوا۔ ابولہب کی آزاد کردہ باندی ''ثویبہ رضی اللہ عنہا'' کے چند دن دودھ پلانے کے بعد شرفاءِ قریش کی عادت کے مطابق آپ ﷺ کو ''حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا'' کی رضاعت میں دے کر مضافاتِ مکہ میں بھیج دیا گیا، اس وقت آپ ﷺ آٹھ دن کے تھے۔

ولادت کے چوتھے سال شقِ صدر کا واقعہ پیش آیا، مؤرخین لکھتے ہیں کہ شقِ صدر کا واقعہ چار بار پیش آیا، ایک: زمانہ طفولیت میں حضرت حلیمہ سعدیہؓ کے پاس، دوسری بار دس سال کی عمر میں پیش آیا۔ (فتح الباری، ج:۱۳، ص:۴۸۱) تیسری بار: واقعۂ بعثت کے وقت پیش آیا۔ (مسند أبي داوٗد الطیالسی، ص:۲۱۵) اور چوتھی بار: واقعۂ معراج کے موقع پر۔ (صحیح البخاری، رقم الحدیث: ۳۴۹)۔ بعض نے پانچویں بار کا شقِ صدر بھی ذکر کیا ہے، لیکن وہ صحیح قول کے مطابق ثابت نہیں ہے۔ (سیرۃ المصطفیٰ ﷺ، ج:۱، ص:۷۵) آپ ﷺ تقریباً چھ سال تک ''حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا'' کی پرورش میں رہے۔

ولادت کے چھٹے سال آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ نے اپنے میکے میں ایک ماہ کا قیام کیا، وہاں سے واپسی پر مقام ابواء میں ان کا انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوئیں۔ (شرح المواہب للزرقانی، ج:۱، ص:۱۶۰)

ولادت کے ساتویں سال آپ ﷺ اپنے دادا عبد المطلب کی تربیت میں پروان چڑھتے رہے۔

اور ولادت کے آٹھویں سال ''دادا محترم'' کا انتقال ہوگیا، دادا کے انتقال کے بعد آپ ﷺ اپنے چچا ''ابوطالب'' کی پرورش میں آگئے۔ (طبقات ابن سعد، ج:۱، ص:۴۷)

اور ولادت کے بارھویں سال آپ ﷺ نے اپنے چچا کے ساتھ شام کے پہلے تجارتی سفر میں شرکت کی، اسی سفر میں بحیرہ راہب نے آپ ﷺ کی نبوت کی پیش گوئی بھی دی۔ (الخصائص الکبریٰ، ج:۱، ص:۸۴)

اور ولادت کے چودہویں سال یا پندرہویں سال اور بعض روایات کے مطابق بیسویں سال عربوں کی مشہور لڑائی ''حرب الفجار'' پیش آئی، اس جنگ میں آپ اپنے بعض چچاؤں کے اصرار پر شریک تو ہوئے، لیکن قتال میں حصہ نہیں لیا۔ (روض الانف، ج:۱،ص:۱۲۰) اور ولادت کے سولہویں سال میں آپ ﷺ نے اہل مکہ کے حلف الفضول نامی معاہدے میں شرکت کی۔

اور ولادت کے پچیسویں سال آپ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال لے کر تجارت کا دوسرا سفر شام کی طرف کیا، سفر سے واپسی پر اس سفر میں پیش آنے والے واقعات، تجارتی نفع اور آپ ﷺ کے اخلاق و واقعات سن کر دو مہینہ اور پچیس روز کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ کو نکاح کا پیغام بھجوا کر آپ ﷺ سے نکاح کر لیا۔ (طبقات ابن سعد، ج:۱،ص:۸۳)

اور ولادت کے پینتیسویں سال آپ ﷺ نے بیت اللہ کی ہونے والی تیسری تعمیر کے وقت حجر اسود کو اپنے دست اقدس سے نصب فرما کر خانہ جنگی کے لیے کمر بستہ قبائل قریش کے درمیان باہمی محبت والفت پیدا فرما دی اور اس کٹھن مرحلے کو بحسن وخوبی انجام خیر تک پہنچایا۔ (سیرت ابن ہشام، ج:۱،ص:۶۵) حیات طیبہ کے انتالیس سالوں میں آپ ﷺ کا کردار ایسا بے مثال رہا کہ اپنے تو اپنے غیروں کی زبان پر آپ ﷺ کے بارے میں تھا کہ آپ ﷺ صادق اور امین ہیں۔

ولادت کے چالیسویں سال میں آپ ﷺ نے زیادہ وقت غار حرا میں گزارا، یہاں ہی آپ ﷺ کے سر پر نبوت کا تاج رکھا گیا۔

نبوت کے پہلے سال غار حرا میں آپ ﷺ پر سورۂ علق کی پہلی پانچ آیات نازل ہوئیں۔ (شرح المواہب، ج:۱،ص:۲۰۷) باتفاق مؤرخین آپ ﷺ کو نبوت اتوار کے دن عطا ہوئی، لیکن مہینہ کے بارے میں مؤرخین کا اختلاف ہے، ابن عبد البر رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک آٹھ ربیع الاول کو نبوت سے سرفراز ہوئے، اس قول کی بنا پر بوقتِ بعثت آپ ﷺ کی عمر چالیس سال تھی۔ جب کہ ابن اسحاق رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق سترہ رمضان کو آپ ﷺ کو نبوت ملی، اس قول کے مطابق بوقتِ بعثت آپ ﷺ کی عمر چالیس سال اور چھ ماہ تھی، حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ (فتح الباری، کتاب التعبیر، ج:۱۲،ص:۳۱۳)

نبوت کے دوسرے سال میں آپ ﷺ خفیہ تبلیغ فرماتے رہے، اسی سال حضرت خدیجہ، حضرت ورقہ بن نوفل، حضرت علی المرتضیٰ، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت جعفر بن ابی طالب، حضرت عفیف کندی، حضرت طلحہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت خالد بن سعید، حضرت عثمان بن عفان، حضرت عمار، حضرت صہیب، حضرت عمرو بن عنبسہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہم آپ ﷺ پر ایمان لائے۔ یہ سب اور کچھ دیگر حضرات صحابہؓ سابقین اولین صحابہؓ کہلاتے ہیں۔

نبوت کے تیسرے سال آپ ﷺ کے متبنیٰ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی۔

نبوت کے چوتھے سال آپ ﷺ کو علی الاعلان دعوتِ دین دینے کا حکم ہوا، جس کی بنا پر کفار خصوصاً قریش کی طرف سے بھی کھلم کھلا دشمنی اور بغض وعداوت کا مظاہرہ ہونے لگا اور اسی سال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ولادت ہوئی۔

نبوت کے پانچویں سال حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے، اسی سال حبشہ کی طرف پہلی اور دوسری ہجرت ہوئی، پہلی ہجرت میں گیارہ مرد اور پانچ عورتیں شامل تھیں۔ (فتح الباری، ج:۱،ص:۱۸۰) اور دوسری ہجرت میں چھیاسی مرد اور سولہ عورتیں شامل تھیں۔ (سیرۃ ابن ہشام، ج:۱،ص:۱۱۱) اسی سال حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو ابوجہل ملعون کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی، یہ اسلام کی خاطر شہید ہونے والی پہلی خاتون ہیں۔

نبوت کے چھٹے سال حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے اور ان کی برکت سے مسجد حرام میں نماز اعلانیہ ادا کی گئی۔ (شرح المواہب، ج:۱،ص:۲۷۶)

نبوت کے ساتویں سال مقاطعۂ قریش کا واقعہ پیش آیا، آپ ﷺ کے ساتھ بنوہاشم اور بنومطلب شعب ابی طالب میں محصور کردیئے گئے، اسی دوران آپ ﷺ کے چچازاد بھائی عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی ولادت ہوئی۔ (روض الانف، ج:۱،ص:۲۳۲)

نبوت کے آٹھویں سال مشرکین مکہ کے مطالبہ پر شق قمر کا بے مثال معجزہ رونما ہوا۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۳،ص:۱۱۸) نبوت کے نویں سال میں بھی شعب ابی طالب میں ہی محصور رہے۔

نبوت کے دسویں سال مقاطعہ ختم ہوا۔ (طبقات ابن سعد، ج:۱،ص:۱۳۹) اور اسی سال آپ ﷺ کے چچا ابوطالب کا انتقال ہوا۔ ان کے انتقال کے تقریباً تین یا پانچ دن بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا، حضور ﷺ نے اس سال کو عام الحزن قرار دیا۔ (شرح المواہب، ج:۱،ص:۲۹۱) اسی سال آپ ﷺ کا نکاح حضرت سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا سے ہوا، اور اسی سال حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کے نکاح میں آئیں، لیکن رخصتی نہیں ہوئی اور اسی سال واقعۂ طائف بھی پیش آیا۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۳،ص:۱۳۵)

نبوت کے گیارہویں سال مدینہ سے آنے والے حاجیوں میں سے آپ ﷺ کی دعوت سے تقریباً چھ آدمی مشرف بہ اسلام ہوئے، اس سے انصار کے اسلام کا آغاز ہوا۔ (البدایہ والنہایہ، ج:۳،ص:۱۴۸)

نبوت کے بارھویں سال آپ ﷺ کو معراج ہوئی اور اسی موقع پر امت پر پانچ نمازیں فرض ہوئیں۔ اسی سال بیعت عقبۂ اولیٰ ہوئی، اس میں ۱۲/افراد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ (شرح المواہب، ج:۱،ص:۳۱۶)

نبوت کے تیرھویں سال بیعت عقبۂ ثانیہ ہوئی، جس میں ۷۳/مرد اور ۲/عورتوں نے اسلام قبول کیا۔ اسی سال مسلمانوں کو مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت مل گئی۔ اسی سال قریش نے نعوذ باللہ! آپ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آکر آپ ﷺ کو قریش کی سازش سے آگاہ کرتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو یہاں سے ہجرت کرنے کی اجازت دے دی۔

اجازت ملنے پر آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی۔

حیاتِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کا مدنی دور

جناب نبی اکرم ﷺ کی ہجرت کے بعد کی حیاتِ مبارکہ کا دور ''مدنی دور'' کہلاتا ہے، جو کہ بڑا تابناک دور ہے جس میں آپ علیہ السلام کی اَن تھک کوششوں، محنتوں اور قربانیوں کے سبب اسلام کو غلبہ ہی غلبہ ملا، آپ علیہ السلام کی جانثار جماعت قدسیہ کے سرفروشوں نے اسلام کی نشر واشاعت کے لیے آپ علیہ السلام کے اشاروں پر اپنا تن من دھن سب کچھ لٹا دیا رضی اللہ عنہم۔ آپ ﷺ کے اس بے مثال دور کا نقشہ کھینچنے کی منظر کشی اتنی طویل ہے کہ شاید کئی ضخیم مجلدات کا پیٹ بھی اس موضوع کو اپنے میں نہ سما سکے، ذیل میں بہت ہی اختصار کے ساتھ ہجرت کے بعد کی زندگی کو اشارۃً بطورِ ایک جھلک کے پیش کیا جاتا ہے۔

ہجرت کا پہلا سال: آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ تین دن تک غارِ ثور میں رُوپوش رہنے کے بعد یکم ربیع الاوّل مدینہ کی جانب ہجرت کی، اسلام کی پہلی مسجد مسجدِ قباء کی بنیاد رکھی، مدینے کے یہودی اور آس پاس کے رہنے والے قبیلوں سے امن اور دوستی کے عہد نامے ہوئے۔ اسی سال حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اسی سال مسجدِ نبوی کی بھی تعمیر کی گئی۔ اذان واقامت کی ابتدا بھی کی گئی۔ انصار اور مہاجرین کے درمیان ایک مثالی بھائی چارہ قائم ہوا، جس کی نظیر تاریخِ عالم میں نہیں مل سکتی۔ اسی سال شوال میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی بھی ہوگئی۔

ہجرت کے دوسرے سال مسلمانوں پر جہاد فرض ہوا، رمضان کے روزے، زکوٰۃ، صدقۃ الفطر اور عیدین کی نمازیں فرض ہوئیں۔ مسجدِ اقصیٰ کے بجائے بیت اللہ کو جہت قبلہ قرار دیا گیا۔ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ہوا۔ آپ ﷺ کی لختِ جگر حضرت رُقیہ رضی اللہ عنہا کا وصال بھی اسی سال ہوا۔ حق و باطل کا پہلا غزوہ ''بدر'' بھی اسی سال پیش آیا۔

ہجرت کے تیسرے سال آپ ﷺ کا حضرت حفصہ بنت عمر فاروق رضی اللہ عنہا سے اور اس کے بعد حضرت زینب بنت خزیمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی، آپ ﷺ کی لختِ جگر حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا۔ گستاخِ رسول کعب بن اشرف اور ابو رافع کو جہنم رسید کیا گیا۔ اسی سال غزوۂ اُحد کا واقعہ پیش آیا۔

ہجرت کے چوتھے سال بنونظیر کی جلاوطنی ہوئی۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی ولادت ہوئی، اسی سال آپ ﷺ کا حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا۔ اور شراب کے حرام ہونے کا حکم بھی اسی سال نازل ہوا۔

ہجرت کے پانچویں سال شرعی پردہ کا حکم نازل ہوا، زنا کی سزا کا حکم ہوا، صلاۃ الخوف کی مشروعیت ہوئی، تیمّم کی اجازت ملی، واقعۂ افک ہوا اور اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کی شان میں سورۃ النور نازل ہوئی۔ آپ ﷺ کا حضرت جویریہ بنت حارث رضی اللہ عنہا سے اور حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا سے

نکاح ہوا۔ غزوۂ خندق، غزوۂ بنی مصطلق اور غزوۂ بیر معونہ پیش آیا، جس میں ۷۰ حفاظ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو دھوکے سے شہید کیا گیا۔

ہجرت کے چھٹے سال مالدار مسلمانوں پر حج فرض ہوا۔ سورۃ الفتح نازل ہوئی۔ اسی سال حدیبیہ کی صلح ہوئی، آپ ﷺ ۱۴۰۰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہمراہ حج کے لیے روانہ ہوئے، صلح حدیبیہ سے واپسی کے بعد دیگر ممالک کے بادشاہوں کو دعوتی خطوط روانہ فرمائے۔ اسی سال مدینہ منورہ میں قحط پڑا جو آپ ﷺ کی دعا سے دور ہوا۔

ہجرت کے ساتویں سال غزوۂ خیبر پیش آیا۔ اس غزوہ سے واپسی پر لیلۃ التعریس کا واقعہ پیش آیا، جس میں پورے لشکر کی نماز فجر قضا ہوگئی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ ایک یہودی عورت زینب بنت حارث کی طرف سے آپ ﷺ کو زہر دینے کی کوشش کی گئی، آپ ﷺ کا حضرت ام حبیبہ رملہ بنت ابی سفیان رضی اللہ عنہا، حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہا، اور حضرت صفیہ بنت حیی رضی اللہ عنہا سے نکاح ہوا، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا آپ ﷺ کی آخری زوجہ ہیں۔

ہجرت کے آٹھویں سال حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے، آپ ﷺ نے عمرۃ القضاء فرمایا، غزوۂ موتہ اور فتح مکہ کا عظیم الشان واقعہ پیش آیا۔ حضرت ابو سفیان رضی اللہ عنہ مشرف بہ اسلام ہوئے۔ غزوۂ حنین وطائف ہوا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے والد ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا۔ اسی سال آپ ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ پیدا ہوئے۔

ہجرت کے نویں سال غزوۂ تبوک پیش آیا اور اس غزوہ سے واپسی پر منافقین کی بنائی ہوئی مسجد ضرار کو منہدم کر دیا گیا۔ رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی سلول کی موت ہوئی۔ اس سال ستر ۷۰ سے زائد وفود آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ سورۃ التوبہ نازل ہوئی۔ اسی سال آپ ﷺ نے اپنی ازواجؓ سے ایلا کیا اور قسم کھائی کہ ایک مہینہ تک تمہارے قریب نہیں آؤں گا۔ اسی سال آپ ﷺ گھوڑے سے گرے، جس کی وجہ سے دائیں پہلو اور پنڈلی پر خراش آئی، اسی سال حج فرض ہوا، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر الحج بنا کر تین سو افراد کے ساتھ حج کے لیے بھیجا گیا۔

ہجرت کے دسویں سال مسیلمہ کذاب نے اور اسود عنسی نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا۔ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے خطبہ دیا۔ اس خطبے میں آپ ﷺ کی تمام ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن موجود تھیں، جن کی تعداد ۹ تھی۔ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد ۱۰۰،۰۰۰ (ایک لاکھ) سے متجاوز تھی۔ اس موقع پر اسلام کے سارے اصول سمجھا دیئے گئے۔ جاہلیت کی رسموں کو اور شرک کی باتوں کو ملیا میٹ فرما دیا اور امت کو الوداع کہتے ہوئے پوری امت مسلمہ بلکہ پوری کائنات کو یتیم کرتے ہوئے اپنے محبوب حقیقی اللہ جل جلالہ سے جا ملے۔

وصلی اللہ علی النبی الأمی الکریم وعلی آلہ وصحبہ أجمعین

قرآنی رسم الخط!

قاری ضیاء الحق

علماء محققین و ماہرین نے قرآن کریم کی قراءتِ صحیحہ و غیر صحیحہ کے درمیان فرق اور امتیاز کے لیے جو بنیادی اصول وارکانِ ثلاثہ مقرر کر دیئے ہیں، ان میں سے ایک بنیادی رکن مصاحف عثمانی میں سے کسی ایک مصحف کے رسم کے ساتھ موافقت بھی ہے، اب یہ موافقت ظاہراً ہو یا احتمالاً یا تقدیراً۔ سیدنا حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ (شہادت ۳۲ ہجری) نے جو پانچ (یا سات اور ایک قول پر آٹھ) مصاحف لکھوائے تھے، اُن میں سے کسی ایک مصحف میں وہ قراءت لکھی ہوئی ہو، چاہے سارے مصاحف میں نہ بھی ہو۔ دوسرے دواَرکان یہ ہیں: ۱:.....نحوی وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کے موافق ہو۔ ۲:.....صحیح اور متصل سند سے ثابت ہو۔

یہاں اصل موضوع کی طرف بڑھنے سے پہلے یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ صرف ''خط'' اور ''رسم الخط'' میں بہت فرق ہے۔ ''خط'' کے معنیٰ تو یہ ہیں کہ کسی کلمے کو اس کے ان حروف ہجاء سے لکھنا جو اس پر وقف اور ابتداء کے وقت پائے جاتے ہیں، جبکہ ''رسم الخط'' کے معنی ہوں گے'' قرآنی کلمات کو حذف وزیادت اور وصل وقطع کی پابندی کے ساتھ اس شکل پر لکھنا جس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع ہے اور وہ پیغمبر ﷺ سے بتواتر منقول ہے۔

''خط'' اور ''رسم الخط'' کے فرق کو ذہن نشین کرنے کے لیے ذیل میں دی گئی مثالوں پر غور کریں تو آسانی ہوگی:

۱:...العٰلمینَ ۲:...الرحمٰن ۳:...الصٰلحٰت ۴:... ھٰؤلآء ۵:...من نبائِ المرسلین

مذکورہ کلمات کا موجودہ خط رسم عثمانی کے موافق ہے، کیونکہ ان میں الف محذوف الرسم ہے، لکھا ہوا نہیں ہے، لہٰذا اس میں ''خط'' اور ''رسم الخط'' دونوں موجود ہیں، لیکن اگر ان ہی کلمات کو درج ذیل طریقہ پر لکھیں:

۱:... اَلعالمین ۲:...الرحمان ۳:...الصالحات ۴:...ھاألاء ۵:...من نباءِ المرسلین

اب ان میں خط (کتابت) تلفظ کے موافق ہے، مگر رسم عثمانی کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ ان میں الف مرسوم (لکھا ہوا) ہے، لہٰذا یہاں ''خط'' تو ہے، مگر ''رسم الخط'' نہیں ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد اب یہ جاننا ضروری ہے کہ قرآن مجید کا یہ رسم الخط توقیفی وسماعی ہے، یعنی پیغمبر ﷺ سے مسموع اور آپ ﷺ ہی کے اَمر و املاء سے ثابت ومنقول ہے اور لوح محفوظ کی ہیئتِ کتابت اور رسم الخط کے مطابق ''منزل من اللہ'' ہے جس میں رائے اور قیاس کا ذرا بھی دخل نہیں ہے۔ ''**خطان لایقاسان خط القوافی و خط القرآن** '' لہٰذا اس کی اتباع اور موافقت بہرصورت واجب ہے اور مخالفت حرام ہے، محققین علماء کا یہی فیصلہ ہے، چنانچہ علامہ برہان الدین ابواسحٰق ابراہیم بن عمر الجعبری رحمۃ اللہ علیہ (۷۳۲ھ) لکھتے ہیں: ''**رسم المصحف توقیفاً هو مذهب الأربعة۔**'' (شرح العقیلۃ)

کتب تواریخ وتراجم بتاتی ہیں کہ جناب رسالت مآب ﷺ کے دور سعادت میں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو معروف بالکتابت تھے اُن کی کل تعداد چھپن تھی، ان کو عموماً پانچ قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱:.....کاتبین نبیؐ، یعنی وہ حضرات صحابہؓ جن سے آنحضرت رسول مقبول ﷺ قرآنی آیات اور خطوط نویسی کا کام لیتے تھے، ایسے حضرات چونتیس شمار کیے گئے ہیں۔

۲:.....کاتبین جامعین، یعنی وہ حضرات صحابہؓ جو بذات خود قرآن کریم کو بذریعہ تحریر وکتابت جمع فرماتے تھے، یہ چھ ہیں۔

۳:.....کاتبین مصاحف، وہ حضرات صحابہؓ جو مصاحف عثمانی کی کتابت میں شریک رہے، یہ تین ہیں۔

۴:.....کاتبین حدیث، وہ حضرات صحابہؓ جو وحی خفی یعنی احادیث نبوی کے تحریر کرنے اور کتابت کرنے کا خاصا اہتمام فرماتے تھے، ان کی تعداد سات ہے۔

۵:.....کاتبین محض، وہ حضرات جو طرز اور تحریر کے اسلوب سے بخوبی آگاہ تھے، ان کی تعداد چھ ہے۔ اس طرح گویا تمام حضرات کاتبین صحابہؓ کی کل تعداد چھپن ہے۔

زمانہ اسلام سے بہت پہلے عرب میں علم الانساب اور شعر وشاعری کا بہت چرچا تھا جو قدیم زمانے سے چلا آرہا تھا، مگر یہ سب محض زبانی وکلامی تھا، چونکہ عرب قوم کے حافظے بھی عموماً حیرت انگیز طور پر قوی ہوتے تھے، لہٰذا اسی پر سب کا دارومدار تھا، تحریر کا رواج نہیں تھا، نہ حرف شناسی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے قبیلہ بنی طلحہ کے تین افراد مرامر بن مرہ، اسلم بن سدرہ، اور عامر بن جدرہ نے کتابت نسخ کی بنیاد ڈالی، انہوں نے قدرتی ذکاوت کی بنیاد پر یکجا ہوکر حروف کی شکل اور وضع قرار دی اور حروف تہجی کو سریانی زبان کی ترتیب پر مرتب کیا، جب یہ اس کام سے فارغ ہو چکے اور حروف کے نقوش اور ان کی صورتوں کی باہمی ترتیب پر قدرت حاصل ہوگئی تو پھر حیرہ کے باشندگان نے باضابطہ اس فن کو ان سے سیکھا، انہی حیرہ والوں کا ایک شاگرد بشیر بن ولید (جو دومۃ الجندل کا رئیس تھا) زیارت کعبہ یا کسی اور

غرض سے مکہ مکرمہ آیا تو وہاں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بہن صہبا بنت حرب سے نکاح کرلیا، پھر حضرت ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ (والد حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) سے ملا، انہوں نے بشیر سے فن کتابت سیکھنے کی درخواست کی، چنانچہ حضرت ابوسفیانؓ اور ابوقیس بن عبدمناف یہ دو شخص مکہ میں بشیر کے شاگرد بنے، بعد ازیں انہوں نے اہل طائف کو تحریر سکھائی اور قریش کے دیگر قبائل بھی رفتہ رفتہ اس فن کو سیکھتے گئے، اس طرح فن کتابت کا عرب اور حجاز کے اکثر قبائل میں رواج ہوگیا۔ مدینہ منورہ میں قبل از اسلام تحریر و کتابت رائج و متعارف ہونا شروع ہوگئی تھی، انصار اپنے قصائد و اشعار بذریعہ کتابت قلم بند کرنے لگے تھے۔

خط عربی (حمیری) نے تبابعہ کے دور میں ترقی پائی، پھر ان کے ختم ہونے کے بعد آل منذر یعنی سلاطین حیرہ کے ہاں فن کتابت کا رواج ہوا، کیونکہ یہ تبابعہ کے قرابت دار تھے، پھر حیرہ کی شاگردی قریش اور اہل طائف نے اختیار کی۔ جب سلطنت عرب کا دامن وسیع ہونے لگا اور بصرہ و کوفہ کو دارالخلافہ ہونے کا شرف حاصل ہوا، تو اب ظاہر ہے کہ والیان حکومت و ارکان سلطنت کو فن کتابت کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اور ارکانِ دولت کی سرپرستی کی بدولت اس میں مزید چار چاند لگ گئے اور بڑی حد تک اس میں اصلاحات ہوئیں، چنانچہ خط کوفی آج تک مشہور چلا آرہا ہے۔

عرب کی حدودِ سلطنت بڑھتے بڑھتے جب افریقہ اور اندلس تک جا پہنچیں اور وہاں اسلام کا جھنڈا لہرایا اور بنوعباس نے بغداد کی داغ بیل ڈالی، بغداد چونکہ سلطنت عرب کا مرکز اور دارالاسلام تھا، اس وجہ سے فن کتابت نے یہاں بہت نمایاں ترقی کی، غالباً اسی وجہ سے بغدادی رسم الخط بہت معروف رہا، حتیٰ کہ افریقہ میں اسی کو اختیار کیا گیا، البتہ اندلس میں بنوامیہ نے اپنے خط کو دیگر صنائع کی طرح بہت ہی ممتاز اور جدا کرلیا۔ پھر جب سلطنتِ اسلامیہ تنزل اور زوال کا شکار ہوئی تو خط و کتابت ہی نہیں تمام علوم و فنون نے اپنا منہ موڑ کر رخ تبدیل کرلیا اور مصر و قاہرہ میں جا کر اس کو عروج حاصل ہوا۔

کتابت و تدوین قرآن

عموماً قرآن کریم کی کتابت و تدوین کو نمایاں طور پر تین ادوار میں تقسیم کردیا گیا ہے:

ا:..... پہلا دور، دورِ نبوی (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)

نزولِ وحی کے وقت جب کوئی آیت یا آیات و سورت نازل ہوتی تھیں تو آنحضرت پاک ﷺ اُسے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ وغیرہ کو بلا کر لکھوا دیتے تھے، یہ حضرات کاتبین وحی اسے کبھی ہڈی پر، کبھی کھجور کی ٹہنی یا چھال پر اور کبھی پتھروں کی ہموار تختی پر لکھ لیا کرتے تھے، اس طرح پورے کا پورا قرآن مجید پیغمبر ﷺ کے دورِ مبارک ہی میں پورا ہوگیا تھا، تاہم اُس وقت اکثر دار و مدار حفظ صدری پر تھا، عموماً صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بغیر دیکھے صرف سن کر خداداد قوت حافظہ کی بدولت اپنے سینوں میں محفوظ رکھتے تھے۔

۲:.....دوسرا دور، دورِ صدیقی

پیغمبر ﷺ کی وفات کے بعد سلسلہ وحی منقطع ہونے کی بنا پر درمیانی اضافہ جات کی گنجائش باقی نہ رہی، قرآن کریم جواَب تک باضابطہ طور پر کتابی شکل میں مجتمع اور یکجا حالت میں نہیں تھا، دورِ صدیقی میں یکجا کردیا گیا، جس کا مختصر پس منظر یہ تھا کہ سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت راشدہ میں یمامہ کے مقام پر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مدعی نبوت مسیلمہ کذاب سے ایک خونریز جنگ ہوئی جس میں شہدائے اسلام کی کل تعداد بارہ سوتھی اور بہت سے مجروح تھے، حاشیہ بخاری شریف صفحہ: ۷۴۵ پر مذکور ہے کہ ''کان عدۃ من القراءِ سبع مائۃ ''یعنی اس جنگ میں شہید ہونے والے حفاظ وقراء کی تعداد سات سو تھی، جبکہ ان قراء میں حضرت سالم رضی اللہ عنہ بھی تھے جن کی بڑی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ یہ ان چار جلیل القدر قراء میں دوسرے نمبر پر تھے جن سے پیغمبر ﷺ قرآن مجید پڑھنے کا حکم فرمایا کرتے تھے۔ (بخاری شریف، جلد:۲،ص:۷۴۸)

نیز یہ کہ حضرت سالم رضی اللہ عنہ کے ساتھ جوفوجی دستہ تھا وہ خاص اہل قرآن یعنی قراء وحفاظ کا دستہ سمجھا جاتا تھا، یہ سب حضرات ایسے تھے جن کے پاس قرآن مجید تحریری شکل میں بھی تھا۔ سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کواس اندوہناک صورت حال سے سخت اندیشہ اورفکر لاحق ہوئی، جبکہ واقعے کی اہمیت کا بھی یہی تقاضا تھا، اگر بعد میں بھی ایسے جنگوں کے واقعات رونما ہوتے جن میں قراء وحفاظ شہید ہوتے رہتے تو امت مسلمہ کی اس عظیم نعمت ولازوال دولت سے محروم ہوجانے کا قوی اندیشہ تھا، چنانچہ آپ نے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی توجہ اس جانب کرائی اور آپ نے قرآن پاک کے تمام حصوں کو یکجا طور پر جمع کرنے کی سعی بلیغ فرمائی۔ (بخاری، ج:۲،ص:۷۴۵) اس سلسلے میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کوتتبع اورجمع قرآن کا حکم فرمایا، چنانچہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کولکھنے اورحضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کو لکھانے کا حکم فرمایا۔ انتہائی احتیاط کے پیش نظر ان دونوں حضرات نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ جن حضرات صحابہؓ کے پاس سے قرآن مجید اکٹھا کرتے، ان سے دوگواہ اس بات کے لیے لیتے کہ انہوں نے یہ آیات مبارکہ یا قرآن کا حصہ پیغمبر ﷺ کے بتائے ہوئے رسم الخط پر تحریر کیا تھا، اس طرح انتہائی محتاط انداز میں جمع قرآن کا کام انجام دیا گیا۔ یہ نسخۂ قرآنی سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس آپ کی وفات تک موجود رہا، آپ کی وفات کے بعد امیر المؤمنین سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس تاحیات رہا اور آپ کی شہادت ووفات کے بعد ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس رہا۔ (النشر، ج:۱،ص:۷)

جس حسن انتظام واہتمام کے ساتھ جمع وکتابت قرآن مجید کی یہ عظیم الشان خدمت خلیفہ اول رضی اللہ عنہ نے انجام دی اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس میں کسی بھی قسم کا کوئی سقم یا ادنیٰ فروگزاشت باقی رہی ہوگی! اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وہ مقولہ نقل کیے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا جس میں انہوں نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے وہ اولین ہستی تھے جنہوں نے قرآن کو کتابی صورت میں

جمع فرمایا۔‘‘ (البرہان، ج:۱،ص:۲۳۹)

بہر حال اس عظیم الشان ذمہ داری سے فراغت کے بعد اس کے تصدیق شدہ نسخوں کی بکثرت نقلیں شائع کی گئیں، چنانچہ کوئی مقام کوئی شہر ایسا نہ رہا جہاں لوگوں کے پاس مصاحف کے نسخے نہ ہوں۔

تیسرا دور، دورِ فاروقی

خلیفۃ المسلمین ہونے کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ قرآن کریم کی نشر و اشاعت کی طرف بطور خاص متوجہ ہوئے، چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ اپنے فوجی افسران کو خط میں لکھا کہ میرے پاس حفاظِ قرآن بھیجو، اس پر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے جواباً لکھا کہ میری فوج میں تین سو حفاظ ہیں۔ امام ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: آپ کے عہد خلافت میں امت کے پاس ایک لاکھ سے زائد قرآن پاک کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے، اسی کے ساتھ باجماعت نماز تراویح کی بنیاد آپ نے ڈالی اور پوری مملکت میں اسے نافذ فرمایا، حفظ قرآن کی تحریک کو آپ کے اس فرمان سے زبردست تقویت حاصل ہوئی، اُمت مسلمہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ بڑا احسان ہے کہ آج اس کے پاس قرآن مجید اسی شکل میں ہے جیسا کہ نزول کے وقت تھا، سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی برکت سے محفوظ طریقہ پر پہنچ گیا۔

چوتھا دور، دورِ عثمانی

جب فتوحاتِ اسلامی کا دائرہ وسیع تر ہوا، اور جزیرۃ العرب سے باہر مختلف امصار و بلاد کے لوگ حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے اور لسانِ عرب کے مادری زبان نہ ہونے کے سبب اس کے حروف و الفاظ کے صحیح تلفظ و اداء پر قدرت ان میں عموماً نہیں پائی جاتی تھی، با ایں ہمہ خود قبائل عرب میں مختلف لب ولہجہ کا اختلاف کثرت سے موجود تھا جس کی وجہ سے ان میں مختلف طریقہ اداء تلاوت کے وقت بھی پایا جاتا تھا، اگرچہ فی الحقیقت یہ اختلاف خاص عرب قوم یا عربی زبان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، جیسا کہ ابن قتیبہ رحمۃ اللہ علیہ ان اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

’’فالھذلی یقرأ: ’’عتّٰی عین‘‘ والأسدی یقرأ: ’’تعلمون‘‘بکسر التاء، والتیمی ’’یھمز‘‘والقریش ’’لایھمز‘‘۔‘‘ (تبیان فی مباحث القرآن،ص:۴۴، طاہر الجزائری)

’’یعنی قبیلہ ہذیل ’’حتی حین‘‘ کو ’’عتی عین‘‘ پڑھتے ہیں، اور اسدی لوگ ’’تِعلمون‘‘ بکسر التاء پڑھتے ہیں، اسی طرح تمیمی ہمزہ کو بالتحقیق پڑھتے ہیں اور قریش ہمزہ نہیں پڑھتے ہیں۔‘‘

اسی طرح قبیلہ قیس کے لوگ تانیث کے کاف کا تلفظ شین سے اس طرح کرتے ہیں کہ ’’قَدْ جَعَلَ رَبُّکِ تَحْتَکِ سَرِیًّا‘‘ کو ’’رَبُّشِ تَحْتَشِ سَرِیًّا‘‘ پڑھتے ہیں، تمیمی ’’أَن‘‘ کو ’’عن‘‘ ادا کرتے ہیں اور یہی تمیمی ’’سین‘‘ کی جگہ ’’ثا‘‘ کا تلفظ کرتے تھے، مثلاً: ’’برب الناث، ملک الناثِ‘‘ پڑھتے تھے۔

قارئین کرام غور فرمائیں کہ جب لب ولہجہ کے اختلاف میں قبائل عرب کا یہ حال تھا، تو اہل عجم کا

کیا پوچھنا؟ یوں بھی لب ولہجہ اور زبان کا اختلاف آپ کو ہر دور میں ملے گا۔ اب اگر قرآن کریم کی کتابت وطباعت مختلف انداز، تلفظ اور طرح طرح کے لب ولہجہ کے لحاظ سے ہوتی تو آج ہمارا کیا حال ہوتا؟ امت عظیم اختلاف وتفریق کا شکار ہوکر رہ جاتی، اسی کے ساتھ دوسرا مسئلہ یہ بھی درپیش تھا کہ عوام الناس معلمین سے قرآن سیکھتے، پڑھتے اور دوسروں کو تعلیم دیتے رہے، ان معلمین میں بعض تعلیم کے وقت کچھ تشریحی وتوضیحی کلمات کا اضافہ بھی کرتے تھے اور متعلمین بعض مرتبہ اسے قرآن کا جز وسمجھ کر محفوظ کر لیتے تھے، مثلاً: ''لَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلاً مِّنْ رَّبِّکُمْ'' ......''تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنے ذاتی نسخہ میں ''فی مواسمِ الحج'' کے الفاظ لکھے تھے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایام حج میں تجارت کر کے کچھ مالی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اب ظاہر بات ہے کہ یہ اضافہ محض توضیح وتشریح کی غرض سے تھا۔ اسی طرح ہر تلفظ کی ادائیگی کے لیے پیغمبر ﷺ نے جو اجازت دی تھی، اس میں بھی مبالغہ ہونے لگا اور نوبت سخت قسم کے اختلافات ''کَفَّرَ بعضُهم بعضًا'' تک پہنچنے لگی۔

چنانچہ عہد عثمانی میں فتح آرمینیہ اور آذربائیجان ۳۰ھ کے وقت شام اور عراق کی فوجیں ایک جگہ جمع تھیں، ان دونوں کی قراءت میں تشویشناک حد تک اختلاف پایا گیا، ہر شخص اپنی قراءت کو دوسرے سے افضل قرار دیتا۔ اس جنگ میں دیگر اصحابؓ کے ساتھ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بھی تھے، انہوں نے جب یہ صورت حال دیکھی تو انہیں سخت تشویش ہوئی، پوری تفصیل بخاری شریف صفحہ: ۷۴۶ میں موجود ہے، اسی طرح مشکوۃ، باب فضائل القرآن، صفحہ: ۱۹۳، اور النشر، جلد: ۱، صفحہ: ۷ میں مذکور ہے، جبکہ امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ دانی رحمۃ اللہ علیہ (متوفیٰ: ۴۴۴ھ) کی کتاب ''المقنع'' کو نظم کرتے ہوئے اپنے قصیدۂ رائیہ کے شعر نمبر: ۳۱ سے نمبر: ۳۴ تک کے چار اشعار میں اس کو بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اس سے بڑا دکھ ہوا اور واپس ہوکر آپ نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے یہ واقعہ بیان کر کے ان کی توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ قراءت کو رسم الخط کا پابند اور اضافہ جات کو حذف کیا جائے اور جمع شدہ قرآن سب کے روبہ رو لایا جائے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی رائے کو پسند فرمایا اور ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس سے عہد صدیقی کا جمع کردہ قرآن مجید منگوا کر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمن بن حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ کو اس کام پر مقرر فرمایا۔ (بخاری شریف، ج:۲، ص:۷۴۸)

ان حضرات کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ تاکید کی گئی کہ اس رسم الخط میں تمام قراءات متواترہ ثابت ہوں، امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ 'الاتقان، جلد: ۲، صفحہ: ۲۸۹ میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک مشہور اور مختلف قراءات کا تعلق ہے، جیسے: ''أوصٰی اور وصّٰی، تجری تحتها اور من تحتها، سیقولون اللّٰہ اور سیقولون لِلّٰہِ، فتبیّنوا اور فتثبّتوا، وغیرہ'' یہ سب قراءتیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں موجود تھیں اور چونکہ اس میں نقطے اور اعراب نہیں تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ بعض الفاظ کو جن میں مختلف قراءات

تھیں انہیں کئی طریقے سے پڑھا جا سکتا تھا۔

قراءاتِ متواترہ کو ثابت اور باقی رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی اجازت خود حدیث مشہور سے ثابت ہے، ارشاد فرمایا نبی کریم ﷺ نے ''إن هذا القرآن أُنزل علٰی سبعة أحرف فاقرؤا ماتیسر منه۔'' (متفق علیہ، بخاری، ج:۲،ص:۷۴۷۔مسلم، ج:۱،ص:۲۷۲)

دوسری تاکید یہ تھی کہ دورانِ تلاوت جہاں اختلاف ہو اور مشکل پیش آئے وہاں لغت قریش کو ترجیح دیتے ہوئے اسی کے مطابق لکھا جائے، کیونکہ قریش ہی کی لغت میں قرآن نازل ہوا ہے، چنانچہ قراءتِ قرآن کے بارے میں یہی اختلاف ونزاع حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قرآن کریم کو کتابی صورت میں جمع کرنے وکتابت کا حکم فرمانے کا اساسی وبنیادی سبب تھا۔ اس مہتم بالشان خدمت قرآن کی تکمیل کے بعد مشہور قول کے مطابق قرآن مجید کے پانچ نسخے لکھے گئے۔ (الاتقان، ج:۱،ص:۱۰۴)

یہ نسخے مدینہ طیبہ، مکہ مکرمہ، شام، بصرہ اور کوفہ روانہ کیے گئے۔ دراصل سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا منشأ یہ تھا کہ صرف تحریر کردہ قرآنی نسخوں ہی پر قناعت نہ کی جائے، بلکہ براہِ راست و بالمشافہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے منہ سے قرآن سن کر اپنے سینوں میں محفوظ کرلیں، اس لیے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کہیں کوئی قرآنی نسخہ روانہ فرماتے تو اس کے ساتھ ایک معلم وقاری بھی بھیجتے تھے۔ اس لیے مذکورہ پانچوں شہروں کے لیے ممتاز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم معلم اور نگران مقرر کیے گئے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تعلیم میں صرف قرآنی نسخے کا پڑھ لینا یا مطالعہ کر لینا کافی نہیں، بلکہ کسی ماہر ومشاق معلم سے بالمشافہ سیکھنا ضروری ہے۔ چنانچہ مدینہ طیبہ میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو، مکہ مکرمہ میں حضرت عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ کو، شام میں حضرت مغیرہ بن شہاب رضی اللہ عنہ کو، بصرہ میں حضرت عامر بن عبداللہ القیس رضی اللہ عنہ کو، اور کوفہ میں حضرت عبدالرحمٰن السلمی رضی اللہ عنہ کو نگران مقرر کیا گیا۔ (مناہل العرفان، ج:۱،ص:۳۹۶-۳۹۷)

اور ایک نسخہ آپ نے اپنے لیے خاص فرمایا جسے ''مصحف امام'' کہا جاتا ہے، اس طرح کل تعداد ان مصاحف کی چھ ہوگئی۔ پھر بعض نے تعداد آٹھ بتائی ہے، اس اعتبار سے ساتواں بحرین اور آٹھواں یمن ارسال فرمایا۔ بعض کے نزدیک آپ نے ایک نسخہ مصر بھی روانہ فرمایا۔ (النشر، ج:۱،ص:۷)

قرآنیت کے اصول ثلاثہ میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ جس قرآن کا رسم الخط مصاحف عثمانی کے مطابق ہوگا وہی قرآن کہا جائے گا، اس کے خلاف جائز نہیں۔

قرآن مجید کو مصحف کا نام سب سے پہلے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں دیا گیا، چنانچہ محمد بن عبداللہ بن اشتہ متوفی ۳۶۰ھ اپنی کتاب ''المصاحف'' میں بطریق موسیٰ بن عقبہ روایت کرتے ہیں کہ جب قرآن کریم کو جمع کرکے اوراق پر لکھا گیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس کا کوئی نام مقرر کیا جائے، بعض حضرات نے ''السِّفر'' (پیغامات) تجویز کیا، آپ نے فرمایا: یہ یہود کا تجویز کردہ نام ہے، بعض نے حبشہ میں رائج نام یعنی ''المصحف'' تجویز کیا جس پر اتفاق ہوگیا اور قرآن

مجید کو ''المصحف'' کہا جانے لگا۔

سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مذکورہ بالا علاقوں میں مصاحف روانہ کرکے یہ حکم جاری فرمایا کہ اس کے علاوہ جس کے پاس بھی ذاتی قرآن کے نسخے موجود ہوں وہ حکومت کو بھیج دیئے جائیں، چنانچہ دوسرے تمام نسخے تلف کردیئے گئے۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کا یہ فیصلہ بہت سی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی تھا، کیونکہ بعد میں ان نسخوں کا وجود امت میں زبردست افتراق واختلاف کا سبب بن سکتا تھا، عہد رسالت مآب ﷺ سے جس قدر دوری ہوتی جاتی، اسی قدر یہ نسخے امت مسلمہ کے لیے زیادہ مضر ثابت ہوتے۔

فائدہ مہمہ

یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ قرآن کریم کے جن کلمات میں ایک سے زائد قراءتیں متواتر دلیل سے ثابت نہیں تھیں، ان کو ایک ہی طرح سے لکھا جاتا تھا، لیکن جن کلمات قرآنی میں بدلیل تواتر ایک سے زائد قراءتیں تھیں ان تمام قراءتوں کا اظہار صرف ایک ہی رسم الخط کے ذریعہ ہر جگہ ممکن نہ تھا، اس لیے کتابت کرنے والے ایسے تمام کلمات کو ایک نسخہ میں ایک متواتر قراءت کے اظہار کے لیے ایک طرح اور دوسرے نسخہ میں دوسری متواتر قراءت کے اظہار کے لیے دوسری طرح اور تیسری متواتر قراءت کے اظہار کے لیے تیسرے نسخے میں تیسری طرح لکھنے پر مجبور تھے، اس مجبوری میں مصاحف میں تعدد ناگزیر تھا۔

بہرحال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس اقدام کو سب حضرات نے بڑی وقعت اور پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا، قرآن کریم کے ذاتی وانفرادی نسخوں کے معدوم کیے جانے کا اقدام آپؓ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے مشوروں کے بعد کیا تھا، چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ فرمایا کرتے تھے کہ: عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھلائی کے سوا کچھ نہ کہو، بخدا آپ نے مصاحف کے بارے میں جو کچھ بھی کیا وہ ہمارے مشورے کے مطابق اور ہماری موجودگی میں کیا۔ (الاتقان، ج:۱،ص:۱۰۳) بعض نے کہا کہ حضرت سوید بن غفلہ رضی اللہ عنہ کا بھی یہی قول ہے۔

بہرحال ان مصاحف عثمانی میں نقطے اور اعراب نہیں تھے جن کا فائدہ یہ تھا کہ مختلف قراءات پڑھی جاسکتی تھیں، نیز ان میں آیات اور سورتوں کی بعینہٖ وہی ترتیب تھی جو کہ موجودہ قرآنی نسخوں میں ہے۔

اس امر میں بھی کوئی شک وشبہ نہیں کہ قرآن مجید فرقان حمید کے سوا دنیا کی کسی کتاب کی حفاظت کے لیے وہ اہتمام نہیں کیا گیا جو قرآن کے حصے میں آیا، قرآن کریم کے سوا دنیا میں کوئی کتاب بطریق تواتر انسانوں تک نہیں پہنچی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے ''لَایَأْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَکِیْمٍ حَمِیْدٍ''، یعنی باطل اس قرآن میں نہ آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے (کسی راہ سے جگہ نہیں پاسکتا) یہ حکمت والے، سزاوارِ حمد وثنا کا نازل کردہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید کے لفظاً ومعنیً، رسماً وکتابۃً ہر اعتبار سے خود رب العزت ہی محافظ ہیں، قال تعالیٰ: ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَإِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۔''

خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا امت مسلمہ پر یہ عظیم احسان ہے کہ آپ نے رسم الخط وکتابت

کی حد تک قرآن پاک میں وحدت کا رنگ پیدا کردیا ’’فجزاه الله عن أمة محمد ﷺ خير الجزاء۔‘‘

دورِ حاضر میں عالم اسلام میں جو مصاحف کہ مروج اور متداول ہیں، ان میں بیشتر کا رسم عموماً مصاحف عثمانیہ کے رسمِ عثمانی کے مطابق ہے، چاہے وہ مصحف حفص ہو کہ زیادہ تر مصر، شام یا سعودیہ میں رائج ہے، جسے مصحف مشارقہ بھی کہا جاتا ہے، یا وہ روایت ’’ورش‘‘ اور ’’قالون‘‘ والا مصحف ہو جسے مصحف مغاربہ کہا جاتا ہے، اور مراکش، الجزائر اور موریطانیہ وغیرہ میں متداول ہے، یا وہ مصحف نستعلیق ہو جو برصغیر میں مطبوع اور معمول بہ ہے، ’’مجمع ملک فهد‘‘ میں بھی اسی نسخہ کو مصحف تاج یا نستعلیق کا نام دیا گیا ہے۔

مذکورہ تین قسم کے مصاحف ہی عالم اسلام یا بلاد اسلامیہ میں پائے جاتے ہیں۔ ان مصاحف میں خصوصاً حذف الف اور اثبات الف کے اعتبار سے جو فرق مشاہدے میں آیا ہے، اس کی اصل بنیاد و دلیل دراصل وہ قدیم مصاحف ہیں جن میں اوپر سے یہ اختلاف چلا آتا ہے، جبکہ ائمہ رسم اور محققین علماء نے بھی بنیاد انہی مصاحف کو بنایا ہے، ان میں امام دانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ ’’المقنع‘‘ متوفی ۴۴۴ھ اور ان کے ارشد تلمیذ امام ابوداؤد بن نجاح رحمۃ اللہ علیہ کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ اب قرآنی کلمات میں الف کے حذف و اثبات میں اختلاف کے پیش نظر پاکستان میں متداول مصحف تاج یا مصحف نستعلیق کے متعلق بعض سطحی نظر رکھنے والے حضرات مسلسل یہ پروپیگنڈہ کررہے ہیں کہ اس پاکستانی مصحف تاج کا رسم غلط اور بلا دلیل ہے، جبکہ حذفِ الف و اثباتِ الف کے دونوں منہج درست ہیں۔

چنانچہ جمع مذکر سالم میں سولہ کلمات، جمع مؤنث سالم میں سات کلمات اور ان کے علاوہ الف سے یاء تک تمام حروف کے بعد آنے والے الف کے مختلف کلمات میں یہی صورتحال ہے کہ حذف الف و اثبات الف میں امام دانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف کہیں ایک ہے، کہیں مختلف ہے، اس بارے میں تقریباً تین سو کلمات ایسے مذکور ہیں کہ جن میں حذفِ الف و اثباتِ الف کی بنیاد ائمہ کے نصوص وروایات اور قدیم مصاحف پر قائم ہے، مصاحف مشارقہ اور مغاربہ میں بالعموم امام ابوداؤد بن نجاح رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات کو بنیادی حیثیت دی گئی ہے، جبکہ برصغیر کے متداول مصاحف میں امام دانی رحمۃ اللہ علیہ کے نصوص وتصریحات پر عمل کیا گیا ہے، لہٰذا بیک جنبشِ قلم اس کی تغلیط نہیں کی جاسکتی، کیونکہ منہج دونوں صحیح ہیں اور کسی میں رسم عثمانی کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔ ان تمام مناہج کے اصول وضوابط اور ان کے دلائل امام ابوعمرو دانی رحمۃ اللہ علیہ کی ’’المقنع‘‘ اور امام ابوداؤد بن نجاح کی ’’التبيين لهجاء التنزيل‘‘ اور امام شاطبی ضریر رحمۃ اللہ علیہ کی ’’عقيلة أتراب القصائد‘‘ میں موجود ہیں۔

البتہ رسم عثمانی کے جن کلمات میں امام ابوعمرو دانی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ میں باہمی اتفاق ہے، وہاں مصحف تاج میں بھی اسی رسم کی پابندی کی گئی ہے، جہاں اختلاف ہے ان میں امام دانی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات پر دارومدار رکھا گیا ہے، کچھ کلمات ایسے بھی ہیں جن میں امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کی نصوص کو مدنظر رکھا گیا ہے اور

خاص ان کلمات میں امام شاطبی رحمۃ اللہ علیہ کا مؤقف امام ابوعمرو دانی رحمۃ اللہ علیہ سے الگ ہے۔اسی طرح اس مصحف تاج میں تقریباً دس کلمات ایسے ہیں جو اس منہج سے مختلف ہیں، ان میں یا تو امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ یا کسی دوسرے رسم عثمانی کے امام کے قول کو لیا گیا ہے، چند کلمات ایسے بھی ہیں کہ جن میں بعض قراءات متواترہ کی بنا پر حذفِ الف کو اختیار کیا گیا ہے، اس مصحف تاج اور دوسرے مصاحف خصوصاً مصحف مدینہ کے مابین موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل (۱۷۴۶) کلماتِ رسم میں یہ فرق ہے، جن میں تقریباً ۹۸/فیصد میں مصحف تاج میں امام ابوعمرو دانی رحمۃ اللہ علیہ کے منہج کو لیا گیا ہے اور مصحف مدینہ میں امام ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کا منہج اختیار کیا گیا ہے۔

اب چند سالوں سے پاکستان میں ایک مخصوص لابی پاکستانی مصاحف کے رسم اور ضبط سے متعلق شکوک وشبہات پھیلا رہی ہے، چونکہ اس مسئلہ پر کوئی مدلل اور مرتب دستاویز منظر عام پر نہ تھی جس کی وجہ سے عالم عرب کے بعض اسکالرز اور ان کی دیکھا دیکھی بعض ہمارے پاکستانی اسکالرز بھی اس غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ عالم عرب میں متداول اور مروج مصاحف خواہ وہ مصری ہوں یا مدنی وہ تو رسم عثمانی کے عین مطابق ہیں اور پاکستانی مصاحف رسم عثمانی کے خلاف ہیں، لہٰذا اب پہلے سے کہیں زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ رسم قرآنی اور برصغیر پاک و ہند کے مروج مصاحف سے مدلل ومرتب دستاویزی ثبوت کے ساتھ کتاب ترتیب دی جائے، جس میں ساری جزئیات، تفصیلات اور مقامات درج ہوں اور دلائل واضحہ سے اس مسئلہ کو مبرہن کیا جائے، امت مسلمہ کو آگاہی دی جائے اور ان کی آنکھیں کھولی جائیں۔ انہیں معلوم ہو کہ امت مرحومہ نے کبھی بھی کسی گمراہی اور سنگین غلطی پر اتفاق نہیں کیا اور ان شاء اللہ! کبھی کرے گی بھی نہیں، چہ جائے کہ رسم قرآنی پر پورے برصغیر کے اہل علم ارباب رسم محققین، ائمہ قراءت و مجودین، ماہرین فن قاطبۃً کتاب اللہ کے رسم پر یکے بعد دیگرے ضلالت وغوایت کا شکار ہو جائیں، کلا وحاشا۔

اس فتنے کا سد باب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کی وزارت مذہبی امور پاکستان میں طبع ہونے والے تمام مصاحف قرآنی میں اپنے رسم عثمانی کی پوری حفاظت و پابندی کرے، ان میں واقعۃً جو اغلاط ہوں ان کی درستگی کے لیے ماہرین رسم عثمانی اہل علم وفضل کا انتخاب کرے، اس کا مربوط ومستحکم نظم قائم کرے، تاکہ قرآنی نسخوں کی طباعت میں رسم عثمانی کی پابندی کو یقینی بنایا جاسکے۔

تاج کمپنی ودیگر مطابع، اہل علم محققین علمائے رسم کا ایک بورڈ تشکیل دیں جو اِن اغلاط کی درستگی کا اہتمام کرے جو فی الواقع اصل رسم کی رُو سے قابل اصلاح ہیں اور جن کی نشاندہی مختلف مقالوں میں کر دی گئی ہے۔

واللہ الموفق والمعین وبہ نستعین آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

دینی واصلاحی جلسے..... چند قابلِ توجہ پہلو

مولانا نایاب حسن قاسمی، انڈیا

علمائے کرام انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے اقوال کی روشنی میں انہیں پوری امت پر وہ فضیلت و برتری حاصل ہے، جو امت کے دوسرے افراد وطبقات کو حاصل نہیں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے اپنی امت کے عابدوں پر عالموں کو فضیلت دی ہے۔ (سنن ترمذی، حدیث: ۲۶۸۷) آپ ﷺ نے ایک حدیث میں یہ ارشاد فرمایا کہ: ''میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے نبیوں کی طرح ہیں۔'' (المقاصد الحسنہ، حدیث: ۶۷۰) قرآن کریم میں یہ فرمایا گیا ہے کہ: ''علم والے اور بے علم لوگ برابر نہیں ہو سکتے۔'' (الزمر: ۹) اس سے بھی مراد وہی اہلِ علم ہیں، جو دین کی سمجھ بوجھ رکھنے والے، خدائے تعالیٰ کی تخلیقات میں غور و تدبر کرنے والے اور کائنات کے ذرات میں مخفی فطرت کے اشاروں کو سمجھنے والے ہیں۔ پھر علماء کو یہ مقام و مرتبہ یوں ہی نہیں مل گیا ہے، بلکہ اس کے بے شمار تقاضے بھی ہیں اور انیک ذمے داریاں بھی کہ:

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کو سوا مشکل ہے

نبی اکرم ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرما جانے کے بعد اس دینِ متین کے تحفظ و بقا اور اس کی ترویج و اشاعت کی ساری ذمے داری علمائے امت کے کندھوں پر ہے، یہ ان کا دینی فریضہ ہے کہ وہ دین کے علوم کو حاصل کر کے اگلی نسل تک پہنچائیں اور امت کی عملی، فکری و عقائدی خامیوں کو دور کرنے کے جتن کریں، ان کی یہ بھی ذمے داری ہے کہ وہ اپنے آپ کو نبوی صفات و خصوصیات سے آراستہ کریں اور امت کے سامنے ایک بہترین عملی نمونہ بنیں، ان کی ذمے داری یہ بھی ہے کہ وہ موجودہ ناگفتہ بہ دور میں دینِ اسلام کی عصری معنویت اور اس کی دائمی آفاقیت و عالمگیریت سے لوگوں کو آشنا کروائیں اور جو لوگ اسلام کی حقانیت کو تسلیم کرنے سے اِنکاری ہیں یا جو مانتے ہیں، مگر ان کی عملی دنیا گمرہی و کج روی کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے، اُنہیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کریں۔ بحمد اللہ! ایسے علماء ہر دور میں پائے جاتے رہے ہیں اور آج کے تشویش ناک ماحول میں بھی ایسی خدامست ہستیاں روئے زمین کے ہر خطے میں پائی جاتی ہیں، جن کی نظروں سے دلوں کی دنیا بدلتی، جن کی باتوں سے پژمردگیِ قلب و روح ختم ہوتی اور جنہیں دیکھنے سے خدا یاد آجاتا ہے، ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں، جو اپنی مسحور کن اور اثر و تاثیر میں ڈوبی ہوئی باتوں کے ذریعے حق

کے کٹر سے کٹر دشمن کو اسلام کا ہمنوا بنالینے کی غیر معمولی قدرت رکھتے ہیں اور ان ہی لوگوں کی بدولت آج اسلام دنیا میں سب سے زیادہ قبول کیے جانے والے مذاہب میں اول نمبر پر ہے، اگرچہ ایسے افراد کی بھی کمی نہیں، جو اپنے دل، قلب اور روح میں برپا ہونے والی ہلچل سے عاجز آکر سکون کی تلاش میں اسلام کی بنیادی تعلیمات، قرآنِ مقدس اور احادیثِ مبارکہ کو پڑھتے اور ان کی غیر معمولی جاذبیت انہیں دامنِ اسلام کی جانب کھینچ لے آتی ہے، مگر اس کے باوجود شخصیتوں کی تاثیر سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتابوں کے ساتھ نبیوں اور رسولوں کو بھی مبعوث فرمایا تھا۔

یہ علماء تبلیغِ اسلام اور معاشرے کی اصلاح کے لیے ہر دور میں الگ الگ طریقے اختیار کرتے رہے ہیں، اِن ہی میں سے کچھ طریقے وہ ہیں جو آج کل بہت رائج ہیں، مثلاً: تبلیغی تحریک کی شکل میں، اس طرح کہ کچھ لوگوں کی ایک جماعت دنیا بھر کے مختلف ملکوں، شہروں، دیہاتوں کی مسجدوں میں جاکر قیام کرتی اور وہاں گردوپیش میں رہنے والے اُن مسلمانوں کو دین کے مبادیات سے واقف کراتی اور انہیں مسجد کی طرف لاتی ہے، جو باوجود مدعیِ اسلام ہونے کے دین کے بنیادی ارکان کی ادائیگی سے غافل ہوتے اور انہیں بنیادی تعلیمات کی بھی خبر نہیں ہوتی، کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جو اپنے علم ومطالعہ اور حیثیت وطاقت کے مطابق غیر مسلموں میں دعوت وتبلیغ کا کام کرتے ہیں اور ان کی کوششیں بھی بارآور ہوتی ہیں اور ایک طریقہ ہے جلسوں کا کہ کسی متعین شہر یا گاؤں میں، کسی متعین تاریخ میں ''اصلاحِ معاشرہ'' یا ''سیرتِ نبوی (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)'' یا اسی قسم کے کسی عنوان کے تحت کسی دینی ادارے میں یا گاؤں کی کسی کھلی جگہ میں ایک پروگرام منعقد کیا جائے اور اس میں عام لوگوں کو دین کی باتیں بتلائی جائیں اور انہیں اسلام کی موٹی موٹی اور بنیادی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے، بلاشبہ یہ طریقہ بھی اسلام کے تعارف کی توسیع اور اس کی اشاعت اور ناخواندہ وعام مسلمانوں میں دینی شعور بیدار کرنے کے حوالے سے اہم ہے اور اس کے فوائد بھی حاصل ہوتے رہے ہیں، کم ازکم ہندوستان میں تو اس قسم کے اجتماعی پروگرام یا جلسوں کی روایت صدیوں پرانی ہے، خود ہمارے نبی ﷺ بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اکٹھا کر کے انہیں دین کے مسائل اور اخلاق کی تعلیم دیا کرتے تھے۔

جلسے میں فی زمانہ متعدد خرابیاں در آئی ہیں، جو سنجیدہ قسم کے لوگ ایسے جلسوں میں بحیثیت سامع شریک ہوتے ہیں یا اُنہیں بطور مہمان مدعو کیا جاتا ہے، اُنہیں اندازہ ہوگا کہ فی الوقت ایسے بہت سے جلسوں سے اصلاح کا مقصد تو کم حاصل ہورہا ہے، البتہ اس کے مقابلے میں فساد وبگاڑ کے نت نئے دروازے کھلتے جارہے ہیں، آپ تحقیق کریں، تو بہت سے ایسے ''مولوی نما'' جاہل ملیں گے، جو ان جلسوں میں ایک خاص فنکارانہ رنگ وآہنگ میں بے سر پیر کی باتیں کر کے، من گھڑت لطائف وظرائف سنا کر عوام کو ذہنی تفریح مہیا کراتے اور اپنی جیبیں بھرتے ہیں، رات میں دودو، تین تین، چار چار گھنٹے ان کی لچھے دار تقریر ہوگی اور صبح پو پھٹنے سے پہلے ہی یہ لوگ اپنا ''نذرانہ'' ہتھیا کر چلتے بنتے ہیں، بہت سے

لوگ ان کی حقیقت سے واقف بھی ہوتے ہیں، مگر چوں کہ اب دین کے نام پر تفریح بھی لوگوں کا مزاج بنتا جارہا ہے، سو وہ بھیڑ جمع کرنے کے لیے ایسے ہی لوگوں کو بلاتے ہیں، حالاں کہ ہندوستان بھر میں قابل، ذی علم و ذی ہوش علماء کرام کی کمی نہیں، جو صحیح معنوں میں ملت کا درد رکھتے ہیں اور وہ اس کی صحیح رہنمائی کرسکتے ہیں اور کرنا بھی چاہتے ہیں، مگر چوں کہ عام طور پر وہ چرب زبان نہیں ہوتے، اس لیے:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں!

ایک اور بہت بُری لت‘ مسلمانوں کو لگتی جارہی ہے، وہ یہ ہے کہ دینی و اصلاحی جلسوں میں ایسے ادنیٰ درجے کے شاعروں کو بھی دھڑلّے سے بلایا جاتا ہے، جو فی الحقیقت گویّے ہوتے ہیں اور جن کی شاعری تو عام طور پر دینِ اسلام اور اس کی تعلیمات کی فضیلتوں پر مشتمل ہوتی ہے، مگر ان کا سراپا اور طرزِ عمل خود اُن کی چغلی کھارہا ہوتا ہے، نتیجتاً ان کے اشعار سامعین کے کانوں کی عیاشی فراہم کرنے کے علاوہ کسی اور فائدے کا سبب نہیں بنتے، مزید یہ کہ ایک اصلاحی جلسہ اچھے خاصے مشاعرے میں بدل کر رہ جاتا ہے، آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب جلسہ ایک رات کا ہے، کل وقت زیادہ سے چھ گھنٹے کا ہے، مقرروں کی تعداد کم از کم چار پانچ تو ہوتی ہی ہے، اوپر سے شعراء بھی تین چار سے کم نہیں ہوتے، تو اس جلسے میں کیا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ عموماً یہ جلسے‘ جلسے تو کم مگر مشاعرے زیادہ ہوتے ہیں اور ان کا نتیجہ سوائے ’’آمدند، نشستند، خوردند و رفتند‘‘ کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا، بلکہ بسا اوقات ان اجتماعی موقعوں پر ایسے ایسے حادثات بھی رونما ہوجاتے ہیں، جنہیں قلم و زبان پر لایا بھی نہیں جاسکتا۔ ان جلسوں کی ایک بڑی خامی، جو حالیہ چار پانچ سالوں میں متعارف ہوکر سامنے آئی ہے، وہ یہ ہے کہ مشاعروں کے طرز پر ان میں باقاعدہ ’’اناؤنسر‘‘ بھی بلائے جاتے ہیں، جن کی طولانی تمہیدات میں ہی پورے پروگرام کا کم و بیش ایک تہائی حصہ تو ضائع ہوجاتا ہے، عام طور سے یہ اناؤنسر حضرات زبان و بیان کے پیچ وخم سے نابلد ہونے کے ساتھ الفاظ و القاب کی لطافت و نازکی اور ان کے محلِ استعمال سے بھی ناواقف ہوتے ہیں، بہت سے جلسوں میں یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک واقعی قابل، عالم، فاضل اور باکمال مقرر کو سیدھے سادے الفاظ میں دعوت دے دی گئی، جبکہ ایک ’’پینترے باز‘‘ مقرر کے لیے زمین و آسمان کے قلابے ملادیے گئے۔ بے جا القاب کا استعمال تو ہمارے مذہب میں یوں بھی ممنوع ہے، ہمارے نبی ﷺ نے جتنے بڑے بڑے شاہانِ عصر کو اپنے مکتوبات روانہ فرمائے تھے، ان کے سرناموں میں صرف ’’محمد بن عبداللہ‘‘ لکھوایا اور اندر صرف ’’رسول اللہ‘‘، آپ ﷺ نے ایک بار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ: ’’تم لوگ میری تعریف میں اس طرح مبالغہ آرائیاں مت کیا کرو، جیسا کہ نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کے ساتھ کیا، میں تو محض اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں، لہٰذا تم مجھے عبداللہ اور رسول اللہ ہی کہا کرو‘‘۔ (صحیح بخاری، ح: ۳۲۱۳) تو کیا ضرورت ہے کہ ہم کسی کی وقتی خوش نودی حاصل

کرنے اور واہ واہی بٹورنے کے لیے خواہ مخواہ لفظوں کا پُرشور دریا بہائیں۔

یہ ایک بہت بڑا لمحۂ فکریہ ہے، علماء کرام کو اس طرف توجہ دینی چاہیے، یہ بہت اچھی اور قابلِ قدر بات ہے کہ ہم معاشرے کی اصلاح کی مہم چلا رہے ہیں، مگر ہمیں یہ بھی سوچنا ہوگا کہ اس کے پردے میں نادانستہ طور پر ایسے اقدامات تو نہیں کر رہے، جو معاشرے کے مزید بگاڑ اور فساد کا سبب بن رہے ہیں؟ ایسے پیشہ ور خطباء، واعظین اور شعراء کی ایک پوری کھیپ میدان میں اُتری ہوئی ہے، جو قول وعمل کے تضاد، فکری سطحیت، علمی اِفلاس، ذہنی پسماندگی وپس گردی، اخلاقی زوال، نظر اور نظریے کی بے سمتی کی شکار ہے اور نتیجتاً اِن اصلاحی جلسوں سے ملت کو فائدے کی بجائے نقصان ہی اُٹھانا پڑ رہا ہے۔ اگر عام مسلمان اپنی محنت اور خون پسینے سے کمائے ہوئے روپے پیسے دین اور اصلاح کے نام پر اکٹھا کر کے کوئی جلسہ منعقد کرتے اور اس میں شریک ہونے والے علماء ومقررین اور مہمانوں کو منہ مانگی رقمیں دیتے ہیں، تو یہ اُن کا حق ہے کہ ان کی صحیح رہنمائی کی جائے، اُنہیں دین کی صحیح باتیں بتائی جائیں، اُنہیں ملک کے موجودہ تشویش ناک حالات سے باخبر کر کے اُنہیں سلام کی صحیح نمایندگی کی تلقین کی جائے، نہ یہ کہ اُنہیں محض چند تفریحی باتیں سنا کر ٹرخا دیا جائے اور مسلمانوں کو بھی چاہیے کہ وہ دین اور اصلاح کے نام پر کیے جانے والے پروگرام کو تفریحِ طبع کا رنگ نہ دیں، پہلے اپنے علاقے کے کسی قابل ومخلص عالمِ دین یا خطیب سے مشورہ کریں اور ان کے مشورے کی روشنی میں ہی پروگرام کا خاکہ بنائیں، تاکہ ان کی مادی ومعنوی کوششیں بارآور ہوں اور اُنہیں دین ودنیا کے تعلق سے مفید معلومات حاصل ہوسکیں۔ ابھی چوں کہ جلسوں کا موسم ہے اور مارچ سے لے کر جون تک یوپی اور بہار کے گاؤں دیہاتوں میں دینی جلسے تواتر کے ساتھ کیے جاتے ہیں، اس لیے یہ زمینی حقائق سپردِ قلم کردیے گئے ہیں، تاکہ کسی منفی نظریہ کا مظہر گردانے کی بجائے حالات کا سنجیدگی ودیانت داری کے ساتھ جائزہ لینے اور معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ (بشکریہ ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند)

حلال وحرام سے متعلق ریاست کی ذمہ داری

(پہلی قسط)

مفتی شعیب عالم

پی ایس کیوسی اے (PSQCA) اور پیاک (PNAC) وزارتِ سائنس وٹیکنالوجی کے ذیلی ادارے ہیں۔ اول الذکر اشیاء کے لیے معیارات وضع کر کے ان پر عمل درآمد کراتا ہے، جب کہ مؤخر الذکر ملکی اور عالمی معیارات کی روشنی میں ادارہ جات مثلاً لیبارٹریوں اور انسپکشن باڈیوں کی اہلیت جانچتا ہے۔ مصنوعات کے حلال وحرام ہونے کے حوالے سے ان اداروں کے لیے شرعی رہنما خطوط کیا ہوں گے اس سلسلے میں وزارت سائنس نے حلال تصدیقی ادارے سنہا ''S . A . N . H . A'' کے تعاون سے ایک روزہ تربیتی ورکشاپ کا اہتمام کیا تھا۔ زیرِنظر مضمون اس موقع پر کی گئی ایک تقریر ہے جو وزارت سائنس کی مرکزی عمارت اسلام آباد میں کی گئی۔ شرکاء میں وزارت کے ذیلی اداروں سمیت بعض دیگر ریاستی اداروں کے نمائندہ افراد بھی شریک تھے۔

الحمد للّٰہ و کفٰی وسلامٌ علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی، أما بعد: فأعوذ باللّٰہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ''الَّذِینَ إِنْ مَّکَّنَّاهُمْ فِيْ الْأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَأٰتَوُا الزَّکَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ۔'' (الحج:۴۱)

شریعت اور ریاست کا تعلق

قرآن کریم بنی اسرائیل پر اپنے احسانات جتلاتے ہوئے فرماتا ہے:

''یَا بَنِیْ إِسْرَائِیْلَ اذْکُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْ أَنْعَمْتُ عَلَیْکُمْ وَأَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعَالَمِیْنَ۔'' (البقرۃ:۴۷)

آیت شریفہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون سی نعمت ہے جو اُن کو یاد دلائی جارہی ہے، لیکن سورۂ بقرہ کی مذکورہ آیت کے ساتھ سورۂ مائدہ کی آیت کو ملا کر پڑھیں تو بات صاف ہو جاتی ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

''وَإِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یَا قَوْمِ اذْکُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْکُمْ إِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ أَنْبِیَاءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا وَّأٰتَاکُمْ مَّا لَمْ یُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ الْعَالَمِیْنَ۔'' (المائدۃ:۲۰)

معلوم ہوا کہ نعمت سے مراد نبوت ورسالت اور بادشاہت وریاست ہے۔ غور کریں تو واقعی یہ دونوں عظیم نعمتیں ہیں اور اس قابل ہیں کہ بطور احسان ان کا تذکرہ کیا جائے، کیونکہ دینی اور روحانی نعمتوں کا منتہا نبوت ہے اور دنیوی نعمتوں کا نقطۂ عروج ریاست ہے اور ان دونوں کے اندر تمام دینی اور دنیوی نعمتیں سمٹ کر جمع ہوجاتی ہیں۔

جس ریاست کا حق تعالیٰ شانہٗ نے احسان جتلایا ہے اس سے مراد وہ ریاست نہیں جو سیاسیات کی کتابوں میں ملتی ہے اور جس کو فیثا غورث، افلاطون، سقراط وبقراط یا ارسطو نے بیان کیا ہے، وہ بھی نہیں جو ہیگل، اینجلز، ریکارڈو، اسمتھ، کانٹ، بینتھم، روسو، میکاوَلی، کوتلیہ چانکیہ یا لیکاک بیان کرتا ہے، بلکہ ایک ایسی ریاست مراد ہے جہاں حکم الٰہی کی بالادستی اور شریعت کی حکمرانی ہو، کیونکہ اگر ریاست شرعی نہ ہو بلکہ لادین، جابرانہ یا ظالمانہ ہو تو اس کا ذکر بطور احسان کے کیوں کیا جائے؟

ریاست کیا ہے؟ اور اس کے بارے میں قدیم وجدید مفکرین کیا کہتے ہیں؟ اور موجودہ مفکرین کس نظریے پر متفق ہیں؟ ہمیں ان تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں، کیوں کہ ہمارا مقصد ان کے نظریات کو معیار بنا کر قرآن کریم کو جانچنا نہیں، بلکہ قرآن کی بنیاد پر اپنے نظریات کی عمارت استوار کرنا ہے۔

ریاست اگر شرعی ہو تو وہ شریعت سے الگ اور جدا کوئی چیز نہیں، بلکہ اس کا عکس اور پرتو ہے۔ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ''ریاست ظل رسالت ہے اور امام رسول کا نائب ہے۔'' اصل اور عکس میں تضاد نہیں بلکہ اتحاد ہوتا ہے اور اگر تباین وتخالف ہو تو عکس عکس نہیں رہتا۔ علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول ''اسلام ایک ایسی ریاست ہے جو ہمہ تن دین ہے اور ایسا دین ہے جو سراپا ریاست ہے۔''

حقیقت یہی ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ ریاست کا وجوب ہی شریعت کی بدولت ہے اور اس پر مسلمان مفکرین کا اتفاق ہے۔ امام ابو حامد الغزالی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بھی ریاست کی بنیاد شریعت ہے، وہ اس پر کچھ عقلی ونقلی دلائل کا اضافہ بھی کرتے ہیں، مثلاً رسول ﷺ کا منشأ ہے کہ اسلام کا باضابطہ قیام ہو۔ محقق طوسی کے نزدیک تو ریاست شریعت کا ہی ایک مذہبی ادارہ ہے اور دین اسلام کی حیثیت ریاست کے لیے ایک ناظم کی ہے۔ امام ماوردی رحمۃ اللہ علیہ جو بلند پایہ اسلامی سیاسی مفکر سمجھے جاتے ہیں، انہوں نے لکھا ہے کہ ریاست کی اولین ذمہ داری مذہبی اصولوں کا دفاع وتحفظ ہے۔ سیاسی مفکرین کے علاوہ شریعت کے رمز شناس فقہاء بھی اس بات پر ہم زبان ہیں کہ ''**نصب الإمام واجب بالإجماع**۔''

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے نبی اکرم ﷺ کی وفات کے بعد سب سے پہلے خلافت کے مسئلے کو طے کیا تھا۔ حدیث تو یہاں تک کہتی ہے کہ تین بندے ہوں تو اپنا ایک امام بنالیں۔ اگر تین افراد کو یہ حکم ہے تو قوم، ملک اور معاشرے کو بطریق اولیٰ ہے۔

آج کل کو جو فکر پروان چڑھ رہی ہے وہ یہ ہے کہ ریاست اور مذہب دو الگ الگ چیزیں ہیں

اور ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا، یہ مغربی فکر ہے جس کی بنیاد اس پر فلسفہ پر ہے کہ جو قیصر کا حق ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا حق ہے وہ خدا کو دو۔

شریعت ریاست سے مقدم ہے

اگر چہ ریاست اور شریعت لازم وملزوم ہیں اور ان میں جسم اور روح کا تعلق ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کو باضابطہ قیام کے لیے ریاست کی ضرورت ہے اور بے شمار شرعی احکام کی تعمیل ریاست کے وجود پر موقوف ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ اسلام کا ظہور غلبہ کے لیے ہے: ''**لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ**'' اس غلبے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ مسلم قوم غیر مسلم اقوام پر اور ان کی ریاست غیر اسلامی ریاستوں پر حاوی ہو، مگر ان سب کے باوجود اگر ریاست نہ ہو یا ریاست ہو، مگر دینی احکام کی تعمیل نہ کرتی ہو تو میری اور آپ کی ذمہ داری ختم نہیں ہو جاتی، کیونکہ نہ تو شریعت کا وجود ریاست پر موقوف ہے اور نہ ہی ریاست کو شریعت پر کوئی تقدم یا فضیلت حاصل ہے۔ شریعت پہلے ہے اور ریاست بعد میں ہے۔ کائنات کے اولین انسان کے نزول کے ساتھ ہی شریعت بھی اتر گئی تھی، مگر ریاست کا وجود نہ تھا۔ ریاست کا ذکر تو قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور میں ملتا ہے۔ مکہ میں ریاست نہیں تھی، مگر شریعت اتر رہی تھی، باقاعدہ اور باضابطہ اسلامی ریاست کا اظہار تو ہجرت کے بعد ہوا ہے۔ اسی طرح اگر ایک مسلمان اسلامی ریاست کی حدودِ ارضی سے باہر چلا جاتا ہے جہاں ریاست کی عمل داری نہ ہو تو وہ پھر بھی بقدرِ امکان شریعت کا مکلّف رہتا ہے۔

اسلام اور حلال وحرام

حلال وحرام اسلام کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں۔ یہ اسلام کی دوسری تعبیر ہے اور دین کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس کے زیر اثر نہ آتا ہو۔ اسلام کی کوئی سی بھی تقسیم لے لیں حرام وحلال کا تعلق نمایاں نظر آئے گا، چاہے وہ تقسیم اس طرح ہو کہ دین حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مجموعہ ہے یا اس طرح ہو کہ دین اسلام مأمورات اور منہیات کا مجموعہ ہے یا اس طرح ہو کہ اسلام عقائد، عبادات، مناکحات، معاملات، معاشرت اور جنایات یعنی حدود وقصاص کا نام ہے۔ ان سب میں حلال وحرام کا تعلق واضح نظر آتا ہے۔

عقائد میں حرام ہو تو اس کو کفر وشرک کہتے ہیں، عبادات میں حرام آتا ہے تو وہ باطل اور مردود ہو جاتی ہے، معاملات میں حرام سے معاملہ فاسد اور کمائی خبیث اور فریقین گناہ گار ہو جاتے ہیں اور معاشرت میں حرام کا ارتکاب گناہِ کبیرہ ہے۔

حلال وحرام کی حساسیت ونزاکت

حلال حرام کا مسئلہ جتنا اہم اور ضروری ہے اتنا حساس اور نازک بھی ہے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینے کی اتھارٹی نہ میرے پاس، نہ آپ کے پاس، نہ کسی وزارت اور مملکت کے پاس اور نہ ہی

کسی ولی، قطب، غوث اور ابدال کے پاس اور نہ ہی کسی تابعی، تبع تابعی یا صحابیؓ کے پاس، یہاں تک کہ پیغمبر دوجہاں امام الانبیاء ﷺ کے پاس بھی یہ اتھارٹی نہیں ہے۔ سورۂ تحریم کی ابتدائی آیت اس طرح ہے: ''یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآاَحَلَّ اللّٰہُ لَکَ۔'' (التحریم:۱)..... ترجمہ: ''اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر۔''

سورۂ مائدہ میں ارشاد ہے:

''اے ایمان والو! اللہ نے تمہارے لیے جو پاکیزہ چیزیں حلال کی ہیں ان کو حرام قرار نہ دو، اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ یقین جانو کہ اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا اور اللہ نے تمہیں جو رزق دیا ہے اس میں سے حلال پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور جس اللہ پر تم ایمان رکھتے ہو اس سے ڈرتے رہو۔ (المائدۃ:۸۷،۸۸)

سورۂ نحل میں ہے:

''اور جن چیزوں کے بارے میں تمہاری زبانیں جھوٹی باتیں بناتی ہیں، ان کے بارے میں یہ مت کہا کرو کہ یہ چیز حلال ہے اور یہ حرام ہے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ پر جھوٹ باندھوگے۔ یقین جانو کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، وہ فلاح نہیں پاتے۔'' (النحل:۱۱۶)

اب اگر کوئی پروڈکٹ شرعاً حرام کے دائرہ میں نہیں آتی ہے اور کسی نے محض کوالٹی کنٹرول یا حفظانِ صحت کے اصولوں کی خلاف ورزی کی وجہ سے اسے حرام کہہ دیا، جب کہ وہ پروڈکٹ حرام کے زمرے میں نہ آتی ہو تو اس نے خدائی منصب سنبھال لیا یا کوئی شئے حلال تھی، مگر کسی دنیوی مصلحت سے اسے حرام کہہ دیا تو اللہ تعالیٰ کے اختیار کو استعمال کرلیا۔ بعض لوگ احتیاطاً کسی چیز کو حرام کہہ دیتے ہیں، حالانکہ وہ اصل میں حلال ہوتی ہے، یہ رویہ بھی از روئے شرع درست نہیں، کیونکہ احتیاط کسی چیز کو حرام قرار دینے میں نہیں، بلکہ ''اصل'' پر عمل کرنے میں ہے اور اصل گوشت وغیرہ چند اشیاء کو چھوڑ کر اباحت ہے۔

ایصالِ ثواب کی درخواست

حضرت مولانا فضل حق صاحب مدظلہٗ ناظم ماہنامہ ''بینات'' کے چھوٹے بھائی حاجی نذیر احمد ولد عبدالملیک سُکھیرا مرحوم ۱۹؍نومبر ۲۰۱۵ء مطابق ۶؍صفر المظفر ۱۴۳۷ھ بروز جمعرات عرصہ دو سال تک کینسر کے مرض میں علیل رہنے کے بعد تقریباً ۵۵ سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ أللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہ واعف عنہ۔

مرحوم صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے، عرصہ دراز مدینہ منورہ میں سکونت پذیر رہے۔ پسماندگان میں چار بیٹے، ایک بیٹی اور ایک بیوہ چھوڑے ہیں۔ قارئین ''بینات'' سے مرحوم کے لیے ایصالِ ثواب اور دعائے مغفرت کی خصوصی درخواست ہے۔

نسلِ نو پر مغربی تعلیم کے اثرات کا طائرانہ جائزہ

جناب سید خالد جامعی

Nutty as a Noodle Stories (دوسری اور آخری قسط)

Essential Fiction

انگریزی ادب کے نام پر کیا پڑھایا جارہا ہے؟

Adexcle سسٹم کے تحت تیسری جماعت کے بچوں کو Brian Moses کی مرتبہ "Essential Fiction" پڑھائی جاتی ہے۔ کتاب کی پشت [back] پر اس عظیم شاہکار کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے:

" This Essential fiction anthology has been carefully put to gether to give you some of the very best examples of children's literature"

اگر مغرب میں سب سے بہترین ادب اس کا نام ہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ بدترین ادب کس درجے کا ہوگا؟!! آیئے! اس بہترین شاہکار انتخاب کا جائزہ لیتے ہیں: کتاب میں ایک کہانی ہے ''Rumpelstilskin'' اسے روایتی کہانی ''Traditional Story'' بتایا گیا ہے۔ کہانی کا آغاز ایک غریب چکی والے سے ہوتا ہے جو شیخ چلی کی طرح اپنی خوبصورت بیٹی کے بارے میں اونچی اونچی باتیں ہانکنے کا شوق رکھتا تھا، چکی والا ایک دن بادشاہ کے دربار میں گیا، اس نے کہا کہ میری بیٹی بہت دانا، زیرک اور ہوشیار ہے، وہ بھوسے کو سونے میں تبدیل کرسکتی ہے، یعنی لڑکی کا باپ صرف شیخی خور ہی نہیں جھوٹا بھی تھا اور احمق بھی۔ بادشاہ جو سونے کا دیوانہ تھا، بہت خوش ہوا اور اس سے کہا کہ چلو ہم دیکھتے ہیں کہ تمہاری بیٹی کیا واقعی بھوسے کو سونے میں تبدیل کرنے کا ہنر جانتی ہے؟! اچانک چکی والے کو اپنی احمقانہ جھوٹی باتوں کا احساس ہوا، اس نے بادشاہ کے حضور معافی پیش کی، لیکن وقت گزر چکا تھا۔ بادشاہ نے چکی والے کی لڑکی کو پکڑ کر ایک ایسے کمرے میں بند کردیا جہاں بھوسہ بھرا ہوا تھا۔ بادشاہ نے لڑکی سے کہا: اب میں تمہاری ذہانت دیکھوں گا، اس کمرے میں موجود تمام بھوسے کو صبح سے پہلے پہلے

سونے میں تبدیل کر دینا، ورنہ میں تمہارے سر کو پاش پاش کر دوں گا۔ بادشاہ یہ کہہ کر کمرے سے چلا گیا، تنہا لڑکی رونے لگی، وہ بھوسے کو سونے میں نہیں بدل سکتی تھی، اسے اپنی موت سر پر منڈلاتے ہوئے نظر آ رہی تھی، اچانک دروازہ زور سے کھلا اور ایک چھوٹا سا اجنبی شخص نمودار ہوا، اس نے لڑکی سے پوچھا: تم کیوں رو رہی ہو؟ ماجرا سن کر اجنبی نے کہا: اچھا! اگر میں اس بھوسے کو سونے میں بدل دوں تو تم مجھے اس کے بدلے میں کیا دو گی؟ لڑکی نے کہا: میں اس کے بدلے میں اپنا ہار تمہیں دے دوں گی، چھوٹے سے شخص نے اپنا کام شروع کیا، صبح سے پہلے پہلے بھوسہ سونے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ بادشاہ نے اتنا سارا سونا دیکھا تو بہت خوش ہوا، مگر اس کا لالچ مزید بڑھ گیا، اس نے غریب لڑکی کو پہلے سے بڑا کمرہ دیا جو پہلے سے زیادہ بھوسے سے بھرا ہوا تھا اور حکم دیا تھا کہ صبح سے پہلے پہلے یہ بھوسہ سونے میں بدل دو، ورنہ تمہارا سر پاش پاش کر دوں گا۔ جیسے ہی بادشاہ کمرے سے باہر نکلا، لڑکی رونے لگی، چھوٹا شخص اچانک دوبارہ نمودار ہوا، ماجرا سنا اور پوچھا: چلو میں بھوسہ سونے میں بدل دوں گا، مگر تم اس کے معاوضے میں مجھے کیا دو گی؟ لڑکی نے کہا: میں اپنی انگوٹھی تمہیں دے دوں گی، چھوٹے آدمی نے بھوسے کو سونے میں بدلنے کا کام شروع کر دیا۔

۱:.....کہانی کا پہلا سبق یہ ہے کہ باپ احمق، لالچی، بے وقوف اور جھوٹا ہے اور اتنا بے وقوف کہ اپنی بیٹی کو بادشاہ کے ہاتھوں پھنسوا دیا، اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔

۲:..... بادشاہ اتنا لالچی اور احمق کہ بھوسے کو سونے میں بدلنے کا کام ایک ایسی لڑکی کے سپرد کر دیا جس کے باپ نے اپنے احمقانہ الفاظ واپس لے کر اس سے معذرت کر لی تھی، مگر اس نے سوچا کہ کیا پتہ اُسے یہ ہنر آتا ہو، آزمانے میں کیا حرج ہے؟

۳:..... بادشاہ اتنا ظالم کہ باپ کی غلطی کی سزا ایک معصوم لڑکی کو دینے پر آمادہ ہے اور کہتا ہے کہ اگر تم نے بھوسے کو سونے میں نہیں بدلا تو سر کچل دوں گا، حالانکہ روایتی تہذیبوں میں بادشاہ رعایا کا باپ تصور کیا جاتا تھا اور عورتوں کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ برنارڈ لیوس نے اپنی کتاب ’’What went wrong‘‘ میں 1860ء میں آسٹریا کے صدر مقام ویانا کا واقعہ ایک ترک سفیر کی زبانی نقل کیا ہے کہ وقت کا بادشاہ ویانا کی سڑک پر گھڑسواری کر رہا تھا، اس نے ایک عورت کو آتے ہوئے دیکھا تو گھوڑے کی باگ کھینچ لی، گھوڑا روک کر اترا اور اس عورت کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔ دوسرا واقعہ یہ لکھا ہے کہ بادشاہ چہل قدمی کر رہا تھا، اچانک ایک عورت سامنے سے گزری تو وہ اس کے احترام میں رک گیا، اپنی ٹوپی سر سے اتار کر نیچے جھکا، یہ عورت کا احترام تھا۔ جس مغربی تہذیب کا بادشاہ اٹھارہویں صدی میں عورت کا اتنا احترام کرتا تھا اس تہذیب میں بادشاہ کو اتنا سفاک بتانا درست بات نہیں ہے۔

۴:.....ایک مظلوم لڑکی کی مدد کرنے والا اجنبی چھوٹا شخص بھی لالچی ہے، وہ لڑکی کی مدد رحم، ہمدردی، انسانیت کے جذبے کے تحت نہیں کر رہا، بلکہ اس سے مدد کا معاوضہ طلب کر رہا ہے، یہ کس قسم کی

تہذیب ہے اور کیسا آدمی ہے؟

۵:..... بادشاہ نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اگر لڑکی بھوسے کو سونے کے ڈھیر میں بدل سکتی ہے تو اس کے ابو چکی کیوں چلاتے ہیں؟ وہ تو بھوسے کو سونے میں بدل کر دولت مند بن سکتے ہیں، کسی سلطنت کو سنبھالنے والا بادشاہ تو ذہین ہوتا ہے۔ لڑکی نے پہلی بار جب بادشاہ کو سونے کا ڈھیر بنا کر دیا تو بادشاہ خوش ہوا، لڑکی نے اس وقت سچ بول کر اپنی جان کیوں نہیں بچائی؟ وہ بادشاہ کو سچ سچ بتا دیتی کہ یہ سونا کس نے بنایا ہے، مگر وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی تھی؟ جبکہ تیسری بار بھوسے کو سونا بنانے کے بعد بادشاہ نے شادی کی پیشکش کی تھی، اسے لڑکی کی نہیں بلکہ سونے کی لالچ تھی، وہ سونے کی کان سے شادی کر رہا تھا، انسان سے نہیں، شادی سے پہلے بادشاہ نے اور لڑکی کے باپ نے کوئی مشورہ نہیں کیا، نہ لڑکی نے بادشاہ سے کہا کہ میں اپنے ماں باپ سے پوچھ لوں۔ حریص حاسد لڑکی کو محل کی زندگی فریب دے رہی تھی۔ لڑکی یہ بھی جانتی تھی کہ اجنبی چھوٹا آدمی بھی لالچی ہے، اگر وہ بادشاہ کے سامنے نمودار ہوتا تو بادشاہ کو بھی سونا ملتا رہتا اور اجنبی چھوٹا آدمی بھی جو چاہتا بادشاہ سے بدلے میں لیتا، اس طرح دونوں لالچی اپنے مقاصد حاصل کر لیتے۔ کہانی میں کسی ایک کردار کو سچا اور ایماندار بتایا جا سکتا تھا، تاکہ بچے سچائی اور ایمانداری سیکھتے، انہوں نے اس کہانی سے یہ سیکھا کہ ملکہ نے جھوٹ بول کر مسئلے کا حل نکالا اور کامیاب رہی۔ کہانی میں یہ پیغام بھی تو دیا جا سکتا تھا کہ اگر سچ بول کر بھی بادشاہ لڑکی کی جان لیتا تو سچائی کی خاطر وہ لڑکی جان کی قربانی دے دیتی، اس طرح لڑکی کے باپ کو بھی لالچ اور جھوٹ بولنے کی سزا مل جاتی۔

۶:..... مدد کرنے والا اجنبی شخص لڑکی کے باپ کی طرح نہایت احمق بھی ہے، اس کے پاس یہ فن موجود ہے کہ وہ ایک کمرہ بھر بھوسے کو سونے میں تبدیل کر لے تو وہ یہ کام کرنے کے بجائے لڑکی سے سونے کا ہار اور انگوٹھی مانگ رہا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ نہایت لالچی ہے، کیونکہ اسے بھوسے کو سونا بنانا تو آتا ہے، لیکن اگر کہیں سے کچھ اور سونا مل جائے تو اس کو ہتھیانے میں کیا حرج ہے؟ کسی مظلوم کی بلا معاوضہ مدد کرنا اچھی بات نہیں، ہر کام کا معاوضہ لینا چاہیے۔ مغرب میں لبرل ازم اور انسانی حقوق کے تحت فلسفہ یہی ہے کہ کام ''work'' ہر شخص کو کرنا چاہیے کہ کام سے سرمایہ ملتا ہے اور سرمایہ سے آزادی ملتی ہے، جس کے پاس زیادہ سرمایہ ہے وہ زیادہ آزاد ہے، لہٰذا آزادی کی ٹھوس شکل مغرب میں سرمایہ ہی ہے۔ جو کام نہیں کرتا، سرمایہ نہیں کماتا، وہ آزاد نہیں ہے، عقل مند نہیں ہے، احمق ہے، نفسیاتی مریض ہے، اس لیے فوکالٹ لکھتا ہے کہ: کام کا نہ ہونا پاگل پن ہے: ''The absence of work is madeness'' لہٰذا مغرب میں ہر شخص کام کرتا ہے، تاکہ سرمایہ کما سکے۔ جو عورت گھر میں رہ کر گھر کے کام کرتی ہے اس کو مغرب کام نہیں تسلیم کرتا کہ اس کام سے سرمایہ نہیں ملتا، اسے مغرب ''working women'' نہیں کہتا، لیکن جس لمحے یہ عورت گھر میں

بچوں کے کپڑے دھونے ، باورچی خانہ میں کھانا پکانے کے بجائے یہی کام لانڈری اور ہوٹل میں دوسروں کے لیے انجام دے جس کے اسے پیسے ملیں تو اس عورت کو فوراً ’’working women‘‘ کہا جاتا ہے۔ رنڈی کو مغرب میں قابل عزت سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنے جسم سے کام لے کر سرمایہ کماتی ہے، لہٰذا مغرب میں اس کا عزت والا نام ہے: ’’sex worker‘‘ کیونکہ مغرب کے بہت بڑے فلسفی جان لاک نے یہ فلسفہ پیش کیا کہ انسان کا جسم اس کی ملکیت ہے اور وہ اس میں آزادانہ طور پر تصرف کا اختیار رکھتا ہے، یعنی جسم اللہ کی ملکیت اور ہمارے لیے امانت نہیں، انسان کی ملکیت ہے۔ لیکن ظاہر ہے روایتی تہذیبوں میں ایسا نہیں ہوسکتا۔

کہانی آگے چلتی ہے، چھوٹا آدمی صبح سے پہلے بھوسے کو سونا بنا کر غائب ہو جاتا ہے، جب بادشاہ دیکھتا ہے کہ لڑکی نے اتنے سارے بھوسے کو سونا بنا دیا ہے تو اس کا لالچ اور بڑھ جاتا ہے، اسے مزید سونا چاہیے، لہٰذا وہ اس رات لڑکی کو ایک بہت بڑے کمرے میں منتقل کرتا ہے جو بھوسے سے بھرا ہوتا ہے اور وہی حکم دیتا ہے کہ صبح تک اسے سونا بنا دو، اگر تم نے ایسا کر دیا تو میں تم سے شادی کر کے تمہیں اپنی ملکہ بنالوں گا، جیسے ہی بادشاہ کمرے سے باہر نکلتا ہے، لڑکی رونے چلانے لگتی ہے، ایک تو خطرہ کہ سونا نہ بنایا تو قتل کر دے گا، دوسرے امید کہ سونا اگر بنا دیا تو شادی ہو جائے گی، اتنا بڑا محل مل جائے گا، خوف اور لالچ کے جذبات اس پر غالب تھے، کچھ کھونے کا غم اور کچھ پانے کی امید۔ اچانک اجنبی چھوٹا شخص دوبارہ نمودار ہوتا ہے، مدد کا وعدہ کرتا ہے، لیکن پوچھتا ہے کہ اس مدد کے صلے میں وہ کیا معاوضہ دے گی؟ لڑکی صدمے سے کہتی ہے کہ اب تو میرے پاس دینے کے لیے کوئی تحفہ نہیں ہے: ’’This time I have no gift to give you‘‘ (مغرب میں جو چیز مانگ کر لی جاتی ہے اُسے تحفہ gift کہتے ہیں، کہانی میں یہی فلسفہ پیش کیا گیا ہے) اجنبی آدمی لڑکی سے وعدہ لیتا ہے کہ اچھا جب تمہارا پہلا بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ مجھے دے دینا۔ وہ وعدہ کر لیتی ہے، اجنبی آدمی مستقبل کے وعدے پر بھوسے کو سونا بنا دیتا ہے، لڑکی کی جان بھی بچا تا ہے، اس کا مستقبل بھی شاندار کر دیتا ہے۔ بادشاہ اس لڑکی سے شادی کر کے ملکہ بنا لیتا ہے۔ ملکہ کے یہاں بچہ پیدا ہو جاتا ہے، ملکہ اپنے لڑکے کے ساتھ ایک دن بیٹھی ہوتی ہے، اچانک دروازہ کھلتا ہے، چھوٹا آدمی آتا ہے اور اسے بھولا ہوا وعدہ یاد دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ لڑکا میرے حوالے کر دو۔ ملکہ رونے لگتی ہے، اس سے بچے کی بھیک مانگتی ہے کہ اسے تم لے کر نہ جاؤ۔ چھوٹا آدمی اسے تین دن کا وقت دیتا ہے کہ اگر تم تین دن کے اندر میرا درست نام بتا دو تو میں بچہ تم سے نہیں لوں گا، تم اسے اپنے پاس رکھ لینا۔ ملکہ ساری رات جاگتی ہے اور اس کا نام سوچنے کی کوشش کرتی ہے، اگلے دن جب وہ شخص آتا ہے تو وہ اندازے سے مختلف نام بتاتی ہے۔ وہ جواب دیتا ہے: تم نے میرا صحیح نام نہیں بتایا، وہ کمرے میں خوشی سے ناچنے لگتا ہے، اسے امید ہے کہ اب اس کی محنت کا صلہ اس بچے کی صورت میں ملے گا۔ اگلے دن ملکہ کا باپ اس سے ملنے آتا ہے،

ملکہ اس سے مدد کی بھیک مانگتی ہے۔ دوسرے دن چھوٹا آدمی دوبارہ آتا ہے، دوبارہ ملکہ سے اپنا نام پوچھتا ہے، ملکہ غلط نام بتاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نہیں تم صحیح نام نہیں بتاسکتیں، اب یہ بچہ میرے حوالے کردو۔ وہ ایک دن کی مزید مہلت دے کر چلا جاتا ہے، ملکہ کا باپ ایک فیصلہ کرتا ہے، وہ اجنبی شخص کے جاتے ہی اس کی تلاش شروع کرتا ہے، جنگل کے ایک کونے میں اسے بہت چھوٹا سا گھر نظر آتا ہے، وہ گھر میں جھانکتا ہے، اسے اندر سے ناچنے گانے کی آوازیں آتی ہیں، گھر میں وہی آدمی نظر آتا ہے، اندر سے آنے والی آوازوں میں اس آدمی کا نام بھی وہ سن لیتا ہے، کیونکہ وہ گارہا ہے: ’’For Rumpl stiltskin is my name‘‘ ملکہ کا باپ یہ نام سن کر دوڑتا بھاگتا محل میں واپس آتا ہے، اپنی بیٹی کو نام بتاتا ہے، اگلے دن جیسے ہی وہ چھوٹا آدمی بچے کو لینے سے پہلے اپنا نام پوچھتا ہے تو ملکہ جھوٹ موٹ دو تین غلط نام بتاتی ہے، اچھا! تمہارا نام Herbert ہے؟ وہ کہتا ہے: نہیں۔ اچھا! تو Humphrey ہے، وہ کہتا ہے: نہیں اور تم اب کبھی میرا نام نہیں بتاسکوگی، لہٰذا بچہ میرے حوالے کردو، ملکہ تو اسے بے وقوف بنارہی تھی، پھر وہ اچانک کہتی ہے: ’’Could it be possibly be Rumpel Stiltskin‘‘ یہ نام سنتے ہی چھوٹا آدمی غصے سے آگ بگولہ ہوجاتا ہے، تمہیں میرے نام کا پتہ کیسے چلا؟ وہ چیختا چنگھاڑتا زمین پر نہایت زور سے اپنے پاؤں مارتا ہے، اس کے پیر زمین میں دھنس جاتے ہیں، وہ غصے سے بے قابو ہوجاتا ہے، وہ پیر زمین سے کھینچ کر نکالتا ہے اور خود دو ٹکڑوں میں تقسیم ہوجاتا ہے۔

کہانی میں آپ نے دیکھا کہ باپ لالچی، شیخی خورا، جھوٹا۔ بادشاہ لالچی، ظالم، شر پسند، حریص حاسد، بدمعاش۔ مظلوم لڑکی کی مدد کرنے والا بھی لالچی کہ مدد کا معاوضہ طے کرتا ہے، پھر مدد کرتا ہے۔ لڑکی بھی لالچی کہ اس ظالم بدمعاش بادشاہ سے خوشی خوشی شادی کررہی ہے جو اس کی جان کا دشمن تھا اور ایک ایسا کام اس کے سپرد کررہا تھا جو وہ نہیں کرسکتی تھی اور قتل کی دھمکی دے رہا تھا، مگر وہ ایسے ظالم بے غیرت بادشاہ کی ملکہ بننے کے لیے تیار ہوگئی، تاکہ اپنے کنگلے باپ کی جھونپڑی کے بجائے عالی شان محل میں خوش رہ سکے۔ لڑکی جھوٹی دھوکے باز کہ اپنے محسن سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کرنے پر تیار نہیں ہوئی، اس کے محسن نے اس کی جان بچائی، اس کی وجہ سے لڑکی کو بادشاہ کا رشتہ ملا، مگر محسن کُشی ضروری تھی۔ اس کا باپ بھی جھوٹا، لالچی، دھوکے باز کہ اتنی سخت مشکلات دیکھنے کے باوجود بھی اس کی اخلاقی حس بیدار نہ ہوئی، اس نے جاسوسی کی اور اپنی بیٹی کی غیر اخلاقی حمایت کی، اس نے بیٹی سے یہ نہیں کہا کہ پہلے میں نے جھوٹ بولا تو اتنی آزمائش آئی، اب ہم سچ بولیں گے، تم اپنا وعدہ پورا کرو، جس میں عہد کا پاس نہیں وہ انسان کسی عزت کے قابل نہیں۔ اس کہانی کے تمام کردار ہی خبیث، گھٹیا، اور اخلاقی اقدار سے عاری ہیں۔ ایسی کہانی کو بچوں کے نصاب میں شامل کرکے ان کو کیا سکھایا جارہا ہے؟

اسی کتاب کا پہلا سبق ہے: ’’The Twelfth floor kids‘‘ اس میں بتایا گیا ہے کہ

اصل زندگی تو فلیٹ کی زندگی ہوتی ہے، بارہویں منزل پر ایک فلیٹ میں چھ لوگ رہتے ہیں، امی ابا چار بچے، اس میں دانستہ طور پر دادا دادی، نانا نانی کو شامل نہیں کیا گیا، یہ خاندان کا حصہ نہیں ہوتے، کیونکہ مغرب میں ان کو old home میں پھینک دیا جاتا ہے، فلیٹ میں Amy کا الگ کمرہ دکھایا گیا ہے، یعنی ہر بچے کا کمرہ الگ الگ ہونا چاہیے۔ دوسری تصویر Eddie کی ہے، وہ بتاتی ہے کہ میں باپ کے بغیر اس فلیٹ میں اپنی بہن اور ماں کے ساتھ رہتی ہوں، ماں کی دکان ہے، وہ دکان پر کام کرتی ہے۔ یہاں پیغام بالکل واضح ہے۔ تیسری تصویر seeta کی ہے، اس کے گھر میں بھی خالہ، پھوپھی، چچی، نانی، دادی، دادا کوئی بوڑھا آدمی نہیں ہے، کیونکہ مغرب میں ان سب کا ٹھکانہ اولڈ ہوم ہے۔ آخری تصویر Dan کی ہے جو اپنی امی اور بلی Jinny کے ساتھ رہتا ہے، گھر میں بوڑھوں کے لیے جگہ نہیں ہے، کتوں بلیوں کے لیے جگہ ہے، ان کو گود میں بٹھایا لٹایا جاتا ہے، اپنے بستر پر سلایا جاتا ہے اور بوڑھی نانی دادی کو اولڈ ہوم میں، یہی تہذیب بتائی گئی ہے۔ Jinny کا باپ اس کے ساتھ نہیں رہتا، اس کا باپ سڑک اور علاقے کے اُس پار دوسری جگہ رہتا ہے جس سے ملنے کے لیے وہ کبھی کبھی اس کے پاس جاتا ہے:

"My dad lives over the other side of town & some times I go to see him at the weekend."

پاکستانی اسلامی خاندانی نظام میں آنکھ کھولنے والے بچوں کو پیغام دیا گیا ہے کہ خاندان یہ ہوتے ہیں، ٹوٹے ہوئے بکھرے ہوئے پتوں کی طرح اڑتے اور پتنگوں کی طرح منتشر خاندان، بغیر باپ کے، بغیر بزرگوں کے اور وہاں عورتیں دکانوں پر بیٹھ کر کام کرتی ہیں، کیونکہ مطلقہ، بیوہ یا معذور شوہر کی عورت کی کفالت کی ذمہ داری مغرب میں نہ باپ اٹھاتا ہے، نہ بھائی، نہ خاندان کے لوگ، نہ قبیلہ، نہ محلے والے۔ ہر شخص اپنی لاش خود ہی اٹھا کر گھومتا ہے، کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ بچے اسکول میں پڑھتے ہیں تو نوکری شروع کر دیتے ہیں، پاکستان کے بچوں کی طرح ماں باپ کے سرمائے سے مزے نہیں کرتے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہر بچے کو قرضہ ملتا ہے، یہ قرضہ وہ خود ادا کرتے ہیں۔ یہی آئیڈیل زندگی ہے۔ مغرب کو پاکستان اور دنیا بھر میں یہی طرزِ زندگی مطلوب ہے۔ یہ سازش نہیں ہے، وہ اسی طرز کو ''الحق'' سمجھتے ہیں۔ یہ الحق اور روشن خیالی کی تحریک [Enlightenment Movement] کے دو اہم ترین دھاروں جدیدیت [Modrenism] اور رومانویت [Romanticism] سے نکلتے ہیں۔ جدیدیت' عقلیت، سائنس وٹیکنالوجی کے ذریعے اور رومانویت' وجدان، ادب، شاعری، قصے کہانی اور آرٹ کے ذریعے روشن خیالی کو عام کرتی ہے۔ یہ کہانیاں رومانوی تحریک کے زیرِ اثر تخلیق ہو رہی ہیں، تاکہ قدیم روایتی معاشروں کو جدید آزاد روشن خیال معاشروں میں تبدیل کیا جا سکے۔

دوسرا سبق ہے: ''It is not fair'' اس میں بتایا گیا ہے کہ کھانے کی چیزوں کا احترام نہ

کریں، کھانے کی چیزوں کو کھیلنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ روایتی، مذہبی، اسلامی تہذیبوں میں کھانے کی چیز کا بہت احترام ہوتا ہے کہ یہ رزق ہے جو اللہ نے دیا ہے، یہ امانت ہے، جسے رزق ملا ہے وہ شکر ادا کرے اور شکر ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ زبانی شکر کے کلمات کہنے کے ساتھ ساتھ اللہ کے رزق اور اس کی نعمتوں میں ان کو شریک کرے جو اس سے محروم ہیں، لہٰذا ہمارے یہاں روٹی زمین پر گر جائے تو اُسے اٹھا کر چومتے ہیں، صاف کر کے کھا لیتے ہیں، اگر کھانے کے قابل نہ ہو تو پرندوں کو ڈال دیتے ہیں، لیکن یہاں بچے کو سبق دیا جا رہا ہے کہ انڈہ چمچے میں ڈال کر دوڑ لگاؤ، خواہ دوڑتے ہوئے انڈہ گر جائے، پھٹ جائے، زمین اور کپڑے گندے کر دے، کیونکہ مزہ تو آ رہا ہے:

''Once come first in the egg & spoon race.''

Kitty کا قد چھوٹا ہے، اس کی جماعت میں ایک لمبا لڑکا ہے جو اسے چھوٹے قد کے باعث جھینگا [Shrimp] کہتا ہے، یہ تہذیب ہے۔ بچوں کا کام ہے قد آدم تصویریں [Mural] بنانا، ٹام اس پر ہنس رہا ہے کہ وہ میورل پر آسمان نہیں بنا سکتی کہ گڈی چھوٹی ہے، کسی بچے نے شرارت سے اس کی جیکٹ اٹھا کر بہت اونچی جگہ پر لٹکا دی ہے، وہ شرم کے مارے کسی سے جیکٹ اتارنے کا نہیں کہتی، وہ باہر جاتی ہے تو اسے سخت سردی لگتی ہے، ایک بدتمیز لڑکی kitty کا مذاق اڑاتی ہے، کوئی تمہیں اپنی ٹیم میں نہیں لے گا، تم بہت چھٹنکی ہو: ''Your are too tiny''، وہ گھر پہنچی تو بہت اداس تھی، ماں کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا بہہ نکلا، اس کے بھائی نے اسے بتایا کہ مجھے بھی اسکول میں بچے shorty کہتے تھے، مگر ان کا رویہ بہت محبت آمیز دوستانہ ہوتا تھا، میں برا نہیں مانتا تھا، ہماری کلاس میں جو لڑکا لمبا اور پتلا تھا اسے ہم stringy کہہ کر پکارتے تھے، لہٰذا نام رکھنے اور چڑانے سے کچھ نہیں ہوتا، اگلے دن بچی اسکول گئی، اس نے دیکھا کہ اس کے دوست Tom کے بال نارنجی بھورے تھے اور اسے اپنے بالوں سے نفرت تھی، اس نے بتایا کہ اسے اسکول میں بچے Carrots کہتے تھے، اس کے بعد Kitty نے میدان میں اسکول کے بچوں کو اپنے اِردگرد دیکھا تو کوئی لمبا، کوئی موٹا، کوئی پتلا، کالا، سانولا، شرمیلا، کوئی بہادر، کوئی گا سکتا تھا، کوئی تیر سکتا تھا، کوئی نازک، نفیس، لطیف، کوئی بھدّا، بے ڈھب تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ ہم سب مختلف ہیں، لہٰذا جو لوگ مجھے Shrimp کہتے ہیں وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں:

''We are all different and I suppose that's fair ''

سبق یہ ہے کہ ایک دوسرے کو برے، گندے، غلط، ناپسندیدہ ناموں سے پکارنا بری بات نہیں ہے۔ ایک دوسرے کے برے برے نام رکھنا، چڑ بنانا، چڑانا بہت اچھی بات ہے۔ یہ تو حقیقت ہے، حقیقت کا بہادری سے سامنا کرنا چاہیے۔ رونے، پیٹنے، چیخنے کی ضرورت نہیں، کیا تہذیب سکھائی گئی ہے؟!!!

ایک سبق ہے: ''The tasting game'' تصویر میں عالیشان باورچی خانہ ہے، ٹائلز

لگے ہوئے ہیں، اوپر سے نیچے تک الماریاں ہی الماریاں ہیں، ایک فریج رکھا ہے جو انواع و اقسام کی اشیاء سے اَٹا پڑا ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر چیزوں کو چکھ کر پہچاننے کا کھیل ہو رہا ہے، چیزوں کے نام سنیے: اسٹرابری جام، Cranberry Jelly، Peanut butter، Raisins، Cheese, Syrup, sugar, vinegar, ice cream, mustard, orange squash, banana Milk shake ایک ایسے ملک میں جہاں پچاس فی صد آبادی پیٹ بھر کر روٹی نہیں کھا سکتی، چھ ہزار آدمی ہر سال بھوک سے خود کشی کر رہے ہیں، وہاں سات سال کے بچے کو یہ آئیڈیل زندگی پڑھائی سکھائی جارہی ہے۔ ایک گھر میں کھانے پینے کی اتنی چیزیں اور لاکھوں گھروں میں دو وقت کی روٹی نہیں ہے، کھیل میں کیا سکھایا جارہا ہے! دیکھئے:

"Then 1 pinched Ben's nose & shoved the spoon into his mouth"

اسی کتاب میں ’’The Toad Tunnel‘‘ ایک سبق ہے۔ Toads کے لیے سرنگ کی صفائی میں کتنی جان لگائی گئی اس کا اندازہ اس کہانی سے ہوتا ہے۔ انسانوں کی بھلائی، بہتری کے لیے کوئی کہانی اس کتاب میں نہیں ہے۔ جانوروں اور جانداروں سے تعلق اور محبت سکھائی جارہی ہے۔ ایک نسل جو اپنی دادی دادا کو گھر میں رکھنے پر تیار نہیں، جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کے لیے اتنی فکرمند اتنی پریشان کیوں ہے؟ انسان غیر اہم جبکہ ڈڈو، مینڈک، آگ، کھانا پینا سب اہم ہے۔

’’At the End of School Assembly‘‘ اس سبق میں زبان و بیان سکھانے کے نام پر بدنظمی، کھیل تماشے کو معیار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ ہلہ گلہ، شور شرابہ، غیر سنجیدگی یہی مغربی تہذیب کا حاصل ہے۔ الحمدللہ! ہمارے تمام انگریزی اسکولوں میں اور وہ اسکول جہاں اسلامی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے عموماً یہی صورت حال ہوتی ہے، چھٹی ہوتے ہی بچے پاگل ہو جاتے ہیں، ظاہر ہے جدیدیت نے اسکول کے نام پر جو جدید قید خانہ تعمیر کیا ہے اس سے آزادی حاصل ہونے پر بچے خوش نہ ہوں تو کیا کریں؟ مگر ماں باپ بہت خوشی سے اپنے ڈیڑھ سال کے بچے کو اس قید خانے میں پیسے دے کر داخل کراتے ہیں۔ یہ بھی تاریخ انسانی کا لطیفہ ہے کہ خدا کے لیے ہم سے پیسے لے لو، مگر اس شیطان کو اپنی قید میں رکھو، ورنہ ہم اپنے گھر میں اس کے قیدی بن جائیں گے۔ صرف ترقی معاشی و مادی فلاح Progress اور Development کے لیے ماں باپ بچے کو اس قید با مشقت میں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ ماریہ سبرٹ نے ’’The Deveopment Dictionary : A guide to knowledge as power‘‘ میں ’’Progress‘‘ پر نہایت تفصیل سے لکھا ہے، ہم بار بار اپنے مضامین میں اسلامی تحریکوں اور اسلامی ذہن رکھنے والوں کو توجہ دلاتے ہیں کہ اس لغت کا لازمی مطالعہ کریں۔ اس صدی کے بہت سے مفروضات، عقیدوں، نعروں، دعووں اور واہموں کی حقیقت کھولنے کے لیے یہ کتاب کافی ہے۔ اسکولوں کے منتظمین اس کے ابواب ’’Development‘‘ اور

''Poverty'' کا لازماً مطالعہ کریں۔ ہائیڈیگر کا آخری انٹرویو جو جرمنی کے رسالے ''Speiegel'' کو دیا گیا جس میں ہائیڈیگر نے وہ تاریخی جملہ بھی کہا تھا'' Only God can save this world '' وہ انٹرویو بھی اسکولوں کے منتظمین کے لیے جدید انسان کے ذہنی، عقلی، حالت منکشف کرتا ہے۔ جدید تعلیم اور جدید جبر انسان کو ایک خاص زاویے سے دیکھنے سوچنے پر مجبور کرتا ہے، وہ ہے تسخیر کائنات اور کائنات کا استحصال۔

'' Ivan ilich '' کی کتاب '' D-schooling Society '' اسکول کے جدید قید خانوں کے بارے میں کچھ نئی باتیں بتاتی ہے۔ امریکہ میں '' Dad School '' اور '' Mom School '' بھی کچھ نئی باتیں سناتے ہیں۔ ہماری تاریخ میں تعلیم وتدریس کا نظام کیا تھا، اس کے لیے ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی کتاب '' Islam & Modrenity '' کا مطالعہ کیجیے، آپ حیران رہ جائیں گے، مدارس دینیہ کا موجودہ اقامتی اور ادارتی نظام بھی اسلامی تاریخ میں اس شکل میں کبھی نہ رہا جو گزشتہ ایک صدی میں حالات کے تقاضوں کے تحت وجود پذیر ہوا ہے۔ اس موضوع کو سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''حیات شبلی'' میں تاریخی حوالوں سے بیان کیا ہے، اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ ادارتی اقامتی نظام کے جہاں فوائد ہیں وہیں بے شمار مسائل بھی ہیں جن پر گہرے تدبر کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم یہ تھا کہ ایک ہی مدرسے میں پڑھنے والے تین ہم سبق حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ، عالم اور بزرگ بنے، محمد خان بادشاہ وقت کا وزیر اعظم بنا اور معمار احمد خان تاج محل کا معمار بنا۔ ۱۸۸۶ء میں انگریزوں نے رڑکی میں پہلا انجینئرنگ کالج بنایا، لیکن اس کالج کے بننے سے پہلے تاج محل، بادشاہی مسجد، شالامار باغ اور ہندوستان بھر میں تعمیرات کے اعلیٰ ترین شاہکار تخلیق کرنے والے کسی انجینئرنگ کالج سے فارغ التحصیل نہیں تھے۔ ہڑپہ، موہنجوڈرو، بابل، نینوا، روم، ایران، یونان، چین میں آخر فنون کہاں سے سیکھے جاتے تھے؟ اہرام مصر بنانے والے فن کاروں نے کسی انجینئرنگ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ ان سوالات اور نکات پر غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم تعمیراتی دنیا کے شاہکار تخلیق کرنے والے اذہان کی تعمیر، تشکیل، تربیت، تدریس کے نظام سے واقفیت حاصل کرسکیں۔ ہمارا مقصد صرف غور و فکر کے نئے دریچے کھولنا ہے، نہ کہ حاضر و موجود نظام کو حرام یا کفر قرار دے کر یکسر مسترد کردینا۔ ہم ایک خاص تاریخ، زمان و مکان میں پیدا ہوئے ہیں، جو کچھ حاضر ہے اسے گہری نظر سے جاننا اور جانچنا ہے۔ اگر تنقیدی شعور بیدار رہے تو متبادل نظام کا خاکہ بھی تخلیق ہوسکتا ہے اور حاضر و موجود میں اصلاح، تصحیح و ترمیم کے امکانات بھی روشن ہوتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھا جائے، حاضر و موجود کی بڑے پیمانے پر اصلاح اور متبادل کی جستجو۔ اس کے لیے گفتگو، مباحثہ، غور و فکر کا دروازہ کسی کی نیت و اخلاص پر شک و شبہ کیے بغیر ہمیشہ کھلا رکھا جائے۔

www.banuri.edu.pk

پیر طریقت جناب حاجی عبدالرشید رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت

محمد اعجاز مصطفیٰ

قیوم زماں حضرت مولانا خواجہ ابوالسعد احمد خاں، نائب قیوم زماں حضرت مولانا خواجہ محمد عبداللہ لدھیانوی قدس سرہما کے مرید مسترشد، خواجہ خواجگان حضرت خواجہ خان محمد قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز وسفر وحضر کے خادم، حضرت مولانا خواجہ عزیز احمد دامت برکاتہم العالیہ کے شیخ، پیر طریقت الحاج عبدالرشید صاحب اس دنیا فانی کی ۹۴ ربہاریں دیکھنے کے بعد ۲۲ رمحرم الحرام ۱۴۳۷ھ مطابق ۵ رنومبر ۲۰۱۵ء بروز جمعرات کوراہی بعالم آخرت ہوگئے، **إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون، إن للّٰہ ماأخذ ولہٗ ماأعطٰی وکل شیء عندہٗ بأجل مسمّٰی۔**

حضرت الحاج عبدالرشیدؒ گاؤں اونچا جہ، تحصیل پسرور، ضلع سیالکوٹ میں ۲۱ ربیع الثانی ۱۳۳۹ھ مطابق ۲ رجنوری ۱۹۲۱ء بروز اتوار جٹ قوم سے تعلق رکھنے والے جناب چوہدری غلام حسین مرحوم کے ہاں تولد ہوئے۔

آپ کی تعلیم کا آغاز اسکول سے ہوا، صادق ڈین ہائی اسکول بہاولپور سے آپ نے میٹرک کا امتحان دیا، صادق ای جرٹن کالج بہاولپور سے ایف اے کیا، اس کے علاوہ اردو میں ادیب فاضل کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کیا اور سول انجینئرنگ میں ڈپلومہ حاصل کیا، اس کے بعد محکمہ انہار میں ملازم ہوئے اور ایس ڈی او کے عہدے پر فائز ہوئے۔

حضرت مولانا سید جمیل الدین میرٹھی فاضل دارالعلوم دیوبند جو حضرت خواجہ ابوالسعد احمد خاں قدس سرہٗ کے خلیفہ مجاز تھے، وہ آپ کو حضرت خواجہ ابوالسعد کے پاس لے گئے اور آپ کو بیعت کرایا، آپ نے حضرت خواجہ صاحب سے سلوک نقشبندیہ مجددیہ میں اسباق حاصل کیے۔ حضرت خواجہ ابوالسعد احمد خاں قدس سرہٗ کے وصال ۱۲ رصفر المظفر ۱۳۶۰ھ مطابق ۱۴ رمارچ ۱۹۴۱ء کے بعد ان کے جانشین خواجہ محمد عبداللہ لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ سے تجدید بیعت کی، ان سے سلوک کے برابر اسباق لیتے رہے۔

آپؒ حضرت مولانا خواجہ محمد عبداللہ لدھیانوی قدس سرہٗ کے والہ اور گرویدہ تھے۔ ملازمت کے سلسلے میں جہاں بھی آپ کی تعیناتی ہوتی، اپنے شیخ و مرشد کی خدمت میں تشریف آوری کی درخواست کرتے۔ حضرت شیخ و مرشد شرفِ قبولیت سے نوازتے ہوئے آپ کے ہاں قدم رنجہ فرماتے۔ حضرت خواجہ محمد عبداللہ لدھیانوی قدس سرہٗ نے ایک بار مسکراتے ہوئے آپ سے دریافت فرمایا: ''تم کتنے ریسٹ ہاؤسز پر مدعو کرو گے؟'' آپ نے عرض کیا: ''جب تک اللہ کی توفیق شاملِ حال رہی، بلاتا رہوں گا۔'' آپ کا جواب سن کر حضرت خواجہ قدس سرہٗ بہت خوش و مسرور ہوئے۔ سبحان اللہ! مرید نوازی اور مرشد پر نثار ہونے کی یہ کیسی خوبصورت ادا ہے؟ یقیناً سعادتیں انہی کو نصیب ہوتی ہیں جو ان کے طلبگار رہتے ہیں۔ حضرت خواجہ محمد عبداللہ لدھیانوی قدس سرہٗ نے بھی کسی کے دریافت کرنے پر ارشاد فرمایا، ''بہاولپور میں ہمارے دو ہی خاص ساتھی ہیں، حاجی عبدالرشید اور حافظ عبدالحمید۔''

آپؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار نائب قیوم زماں حضرت مولانا محمد عبداللہ لدھیانوی قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا:

''بعض لوگ ہمارے ہاں آتے ہیں اور فیض باطنی کے حصول میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ اس کے لیے تو وقت درکار ہے۔ رحمتِ حق تدریجاً اترتی ہے۔ بَغْتَةً (اچانک) نہیں آتی۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ فقیری ایک گھڑی ہے، آیا اور پکڑی، یہ جا وہ جا، حالانکہ ایسا نہیں۔ جو طالب مستقل صدق سے آتا ہے اور حسبِ ارشاد ذکر و شکر (اور) حسنِ عبادت میں صبر و ثبات کے ساتھ کاربند رہے تو تب کہیں جا کر اس نسبتِ علیا کا اُمیدوار ٹھہرے گا۔''

نیز آپؒ فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت اقدس (خواجہ محمد عبداللہ لدھیانوی) قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ یہ نعمت نسبتِ علیا نصیب فرمائے تو اس کی حفاظت و نگہداشت کرنی نہایت ضروری ہے۔''

نائب قیوم زماں حضرت خواجہ محمد عبداللہ لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال ۲۷؍شوال ۱۳۷۵ھ مطابق ۷؍جون ۱۹۵۶ء کے بعد خواجہ خواجگان حضرت خواجہ خان محمد قدس سرہٗ سے تجدید بیعت کی اور خانقاہ سراجیہ میں رہ کر آپ خواجہ خواجگان کی خدمت میں مصروف رہے، جملہ اسباق کی تکمیل کے بعد خواجہ خواجگان نے آپ کو خلافت سے سرفراز فرمایا۔ آپؒ نے بھی سلسلۂ نقشبندیہ کو آگے چلاتے ہوئے کئی ایک حضرات کو خلافت سے مشرف فرمایا۔

الحاج حضرت عبدالرشید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پسماندگان میں تین بیٹے چھوڑے ہیں، آپ کی نماز جنازہ حضرت خواجہ خلیل احمد دامت برکاتہم نے پڑھائی اور رحیم یار خان میں مقامی قبرستان میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مغفرت فرمائیں اور جنت الفردوس کا مکین بنائے۔ قارئین بینات سے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایصالِ ثواب کی درخواست ہے۔

اسٹیٹ بینک کی ملازمت!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں مفتیان کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

۱:.....اسٹیٹ بینک آف پاکستان کی ملازمت اختیار کرنا جائز ہے یا ناجائز؟

۲:.....اگر کسی شخص نے اسٹیٹ بینک کے ملازم سے کوئی تحفہ لے لیا ہو تو اُسے کس طرح واپس کیا جائے گا؟

۳:.....اسٹیٹ بینک کے تمام شعبے ناجائز ہیں یا کسی شعبے میں کام کرنے کی گنجائش ہے؟

المستفتی: محمد ظفر ایوب، کراچی

الجواب حامداً ومصلیاً

۱،۳:.....بصورتِ مسئولہ اسٹیٹ بینک کے کسی بھی ایسے شعبہ میں ملازمت اختیار کرنا جائز نہیں ہے، جس میں سودی لین دین ہوتا ہو اور اگر اسٹیٹ بینک کے کسی شعبہ میں سودی کام نہ بھی ہوتا ہو، لیکن چونکہ اسٹیٹ بینک کے تمام ملازمین کو سودی رقم اور سودی آمدنی ہی سے تنخواہیں دی جاتی ہیں اسی بنا پر اس کے غیر سودی شعبہ (مثلاً: نوٹوں کی چھپائی وغیرہ) میں بھی کام کرنا جائز نہیں ہے۔

۲:.....صورتِ مسئولہ میں اگر اسٹیٹ بینک کے ملازم کی طرف سے کوئی تحفہ ملا ہو تو اسے اس ملازم کو لوٹانا واجب ہے، تاہم اگر لوٹانا دشوار ہو تو بغیر ثواب کی نیت کے کسی غریب کو دے دے، تاکہ حرام مال کے استعمال سے اس کا ذمہ فارغ ہو جائے۔ قرآن کریم میں ہے:

’’وَأَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا۔‘‘ (البقرۃ:۲۷۵)

الجامع الصحیح للامام مسلمؒ میں ہے:

’’عن جابر رضی اللہ عنہ قال: لعن رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم آكلَ الربا وموكلَهٗ وكاتبَهٗ وشاهديه وقال: ’’هم سواء۔‘‘ (الجامع الصحیح للامام مسلمؒ، ج:۲،ص:۲۷، ط:قدیمی)

’’فتاویٰ ہندیہ‘‘ میں ہے:

’’ولایجوز قبول هدية أمراء الجور لأن الغالب فى مالهم الحرمة إلا إذا علم أن

أكثر مالہٖ حلال بأن كان صاحب تجارة أو زرع فلابأس به، لأن أموال الناس لاتخلو عن قليل حرام فالمعتبر الغالب وكذا أكل طعامهم كذا فى الاختيار شرح المختار۔'' (فتاویٰ ہندیہ، الباب الثانی عشر، ج:۵، ص:۳۴۲، ط: رشیدیہ)

فتاویٰ شامی میں ہے:

''ويردونها علٰى أربابها إن عرفوهم وإلا تصدقوا بها لأن سبيل الكسب الخبيث التصدق إذا تعذر الرد علٰى صاحبہٖ۔'' (فتاویٰ شامی، ج:۶، ص:۳۸۵، کتاب الحظر والاباحۃ، فصل فی البیع، ط: سعید)

معارف السنن للشیخ البنوریؒ میں ہے:

''قال شيخنا: ويستفاد من كتب فقهائنا ''كالهداية'' وغيرها أن من ملك بملك خبيث ولم يمكنه الرد إلى المالك فسبيلهٗ التصدق علٰى الفقراء ...... قال: والظاهر أن التصدق بمثلہٖ ينبغى أن ينوى بہٖ فراغ ذمتہٖ ولايرجو به المثوبة۔'' (معارف السنن، ج:۱، ص:۳۴، ابواب الطہارۃ، باب ما جاء لاتقبل صلاۃ بغیر طہور، ط: سعید)

فقط واللہ تعالیٰ اعلم

الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہٗ
محمد انعام الحق	محمد داؤد	لائق رحیم
		متخصص فقہ اسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن

www.banuri.edu.pk